راہگذر

مختصر افسانوں کا ایک دِلآویز مجموعہ

مُصنّفہ

عاشق حسین بٹالوی۔ بی، اے ایل ایل۔ بی

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

پبلشرز

لاہور بک شاپ نسبت روڈ لاہور

اشاعتِ اوّل - اکتوبر ۱۹۴۱ء

فہرست

اغلاط نامہ رہگذر

نمبر صفحہ وسطر	غلط	صحیح	نمبر صفحہ وسطر	غلط	صحیح
صفحہ ۳۰ سطر ۱	نین	تین	صفحہ ۱۲۶ سطر ۱۱	کرنی	کرتی
؍؍ ۳۱ ؍؍ ۵	کہری	گہری	؍؍ ۱۲۹ ؍؍ ۵	مجور	مجبور
؍؍ ۵۴ ؍؍ ۷	زمانہ	زنانہ	؍؍ ۱۳۸ ؍؍ ۱۳	شائستہ مزاج	شائستہ اطوار
؍؍ ۵۰ ؍؍ ۴	بلندہ	پلندہ	؍؍ ۱۵۵ ؍؍ ۱۷	وہ سکوں گا	رہ سکوں گا
؍؍ ۵۸ ؍؍ ۱۶	بارگاہِ نار	بارگاہِ ناز	؍؍ ۱۶۲ ؍؍ ۶	میزملن	میزبان
؍؍ ۷۲ ؍؍ ۱۱	تغتیس	تغتیش	؍؍ ۱۶۳ ؍؍ ۱۱	مکاں	مکان
؍؍ ۷۲ ؍؍ ۵	تیزرُو	تیزرَو	؍؍ ۱۶۴ ؍؍ ۷	ناک	نام
؍؍ ۸۴ ؍؍ ۱۱	نین	تین	؍؍ ۶۸ ؍؍ ۱۶	ہوکئی	ہوگئی
؍؍ ۸۹ ؍؍ ۱۴	بی۔اے بعد	بی اے کے بعد	؍؍ ۲۱۰ ؍؍ ۱	بیگانکی	بیگانگی
؍؍ ۹۳ ؍؍ ۱۳	مقابلے کی تاب	مقابلے کی تاب نہ	؍؍ ۲۴۸ ؍؍ ۱۲	خاموشی ور	خاموشی اور
	لاتے ہوئے	لاتے ہوئے		غوروفکر	غوروفکر
صفحہ ۹۳ سطر ۱	بُرقع لپٹی	بُرقع میں لپٹی	صفحہ ۲۶۳ سطر ۵	کلام امتیازی	کلام کو امتیازی
؍؍ ۹۵ ؍؍ ۷	مصائب کازخم خودہ	مصائب کازخم خوردہ		رنگ	رنگ
؍؍ ۱۰۱ ؍؍ ۱۷	حزین وچہرہ	حزین وملول چہرہ	؍؍ ۲۶۵ ؍؍ ۱	منور کرتے	منور کرنے میں
؍؍ ۱۲۲ ؍؍ ۱۱	جیب پانچ روپے	جیب میں سو پانچ روپے			صرف کرتے
؍؍ ۱۲۶ ؍؍ ۱۰	ریج والم سے عامل	رنج والم سے غافل	؍؍ ۲۷۲ ؍؍ ۵	دبائے	دبانے
؍؍ ۱۲۶ ؍؍ ۱۳	ررود کرب	درد وکرب	۔	۔	۔

سردار جیون سنگھ پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر لاہور بک شاپ نسبت روڈ لاہور سے شائع کی۔

انتساب

اُن خوشگوار دنوں کی یاد میں جو آج سے چند سال قبل
اُن کی اور بعض عزیز دوستوں کی دلپذیر صحبت میں بسر
ہوئے تھے اس ناچیز تصنیف کو مسٹر رشید احمد ایم اے
(ایجنٹ امپیریل بنک آف انڈیا) کے نام منسوب کرتا ہوں

؎ حیرت ہے یادگارِ زمانِ جنوں ہنوز
باقی ہیں شوقِ یار کی اب تک نشانیاں

"ع"

لاہور
یکم اکتوبر ۱۹۴۱ء

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا

غالب

دیباچہ

از ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ ایم اے۔ ڈی۔ لٹ، لیکچرر پنجاب یونیورسٹی

افسانوں کا یہ مجموعہ جو راہگذر کے نام سے موسوم ہے۔ نہ صرف اس کے مصنّف کی شخصیّت کا آئینہ دار ہے بلکہ نئے دور کی معاشرت اور نئی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے خیالات وحسیات کا عکس بھی ہے۔ ایک انگریز مصنّف کا قول ہے کہ کسی قوم کی تمدّنی تاریخ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے افسانوں اور قصّوں سے جس قدر مدد مل سکتی ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں مل سکتی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ راہگذر میں جن مجلسی، معاشرتی، اور سیاسی مسائل کو افسانہ کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ افسانہ ہونے کے باوجود حقیقت سے زیادہ بلیغ اور موثر صداقتیں ہیں۔ جن کا ہماری عمرانی اور قومی زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ ہم ان کی صحیح نباضی، اور فہم کے بغیر اپنی قوم کی نفسی اور ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

نئی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے افکار وخیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم سرسری طور پران قوتوں کا جائزہ لیں۔ جو ایک صدی سے ہمارے ضابطۂ فکر ونظر کو ایک خاص قالب میں ڈھال رہی ہیں۔ ہندوستان میں مشرقی اور مغربی تہذیب کی آویزش کی ابتدا اگرچہ دو صدی پہلے ہو چکی تھی لیکن اس جنگ کی نمایاں لڑائی گذشتہ صدی میں شروع ہوئی۔ جبکہ معاشرتی مسائل کے

علاوہ خود مذہب اور دین بھی تنقید اور جرح کا نشانہ بننے لگا۔ مشرق میں مذہب ایک ہمہ گیر نظام حیات ہے۔ جو مجلسی اور تمدنی آئین وقوانین پر حاوی ہے۔ مذہب کے نظریے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تمام زندگی کا نظریہ بدل جاتا ہے پس جب خود مذہب عقل پرستوں کے نقد و تنقید کا موضوع قرار پایا تو اس کے بعد معاشرت کے باقی شعبوں کا تجزیہ اور امتحان کیونکر معرض بحث میں نہ آتا! اُس وقت سے لے کر اب تک ہماری سوسائٹی کے رجحانات ایک لایقینی کی حالت میں ہیں اور مغربی تعلیم و تہذیب کا اثر جس قدر بڑھتا جاتا ہے۔ قومی اور مجلسی زندگی کے اہم مسائل کے متعلق تردد اور استفہام بھی اسی قدر زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ نوجوانان ملک کے ذہن نئے نئے سرچشموں سے سیراب ہو کر ان مسئلوں پر گہری تنقیدی نظر ڈال رہے ہیں جو مشرقی اور مغربی نقطۂ نظر کے درمیان وجہ اختلاف پیدا کر رہے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سیاسی اور ذہنی ہر دو لحاظ سے ایک بہت بڑی حدِ فاصل ہے جو میلانات و رجحانات انسانی کو دو واضح حصّوں میں تقسیم کرتی ہے۔ انگلستان میں جنگِ عظیم سے قبل اور وکٹورین عہد کے آخری دور میں اگرچہ ڈارون کے نظریے کا اثر ادب کے تمام شعبوں پر گہرا اور قوی تھا لیکن اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ مفکرین کا ایک گروہ اس روحانی بے اطمینانی کا علاج تلاش کرنے میں برابر مصروف تھا۔ جو ڈارونی نظریہ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ جان رسکن نے آرٹ اور اخلاق کو باہم منسلک کرتے ہوئے حسن و جمال میں صداقت کا عنصر ثابت کیا۔ اور بٹلر کی کتاب THE WAY OF ALL FLESH میں فطرتِ انسانی کی کمزوری، گناہ کی کشش اور اخلاقی زندگی

کا بلیغ سبق پڑھایا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ رسکن، ہٹلر اور دوسرے مصنفین نے آزاد فکری کے خلاف جو جہاد کیا۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور رہا لیکن اس کے مقابلے پر آسکر وائلڈ اور ڈی۔ ایچ لارنس نے انسانی ذہن و فکر کی جن راستوں کی طرف رہنمائی کی۔ اس سے رسکن وغیرہ کے اثرات بتدریج دماغوں سے نکلتے گئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ متذکرہ بالا دو مصنفین نے ہماری نئی ادبی تحریکوں پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس سلسلے میں ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس نے روس میں ادبیات کی پرانی روشوں کو یکسر بدل دیا۔ ادب کو زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے مطابق پرکھنا اور جانچنا یہ روسی نقطۂ نظر کا امتیازی وصف ہے اس کی رُو سے وہ ادب جس کا تعلق زندگی کی سچی حقیقتوں سے نہ ہو۔ بے کار اور بیمار ادب ہے اور وہ لٹریچر جو عوام کی ضرورتوں اور آرزوؤں، امیدوں اور تمناؤں کا مفسر اور ترجمان نہ ہو لغو اور بیہودہ ہے، نیا ادبی نظریہ روحانی خیال آرائیوں کو حقیقت سے دور اور ادب کی تخئیلی سخن سازیوں کو بے مصرف خیال کرتا ہے۔ ہمارا جدید افسانہ چیخوف، گورکی، گوگول اور ترگنیف سے جس قدر اثر پذیر ہوا ہے۔ اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ ادب، اخلاق اور زندگی کے ان نظریات جدید نے نئے ہندوستان میں بہت گہری ذہنی اور روحانی شورش اور کشمکش پیدا کی۔ ہمارے مصنفین، افسانہ نویس، صناع، ڈرامہ نویس سب ان افکار سے متاثر ہوئے۔ جس کے آثار ان کے کارنامہ ہائے فن میں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان ادبی اور فکری اثرات سے کہیں زیادہ ہندوستان اور ایشیا کے سیاسی ماحول اور بین الاقوامی

واقعات نے ہمارے ادب پر اثر ڈالا۔ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ترکی کی تقسیم ہندوستان میں مارشل لا، حوادث پنجاب اور سوراج کی تحریک نے ملک کی فضا میں زبردست ہیجان پیدا کیا جس سے عوام اور متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات میں نمایاں انقلاب نمودار ہوا۔ ہجرت کی تحریک کی بدولت ہندوستان کے بہت سے مسلمان نوجوانوں کو روس کی زندگی اور افکار سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ یہ نوجوان جب ہندوستان میں واپس آئے تو اپنے ساتھ اشتراکی خیالات لائے جو آہستہ آہستہ نوجوان تعلیم یافتہ گروہ میں بے حد مقبول ہونے گئے۔ چنانچہ ملک میں بہت جلد متعدد اشتراکی انجمنیں قائم ہو گئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم کی جائے اور مسلسل تبلیغ کے ذریعے ان میں بیداری پیدا کی جائے۔ اس دور میں ہمیں جو طبقاتی آویزش نظر آتی ہے، وہ اسی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ رفتہ رفتہ اس تحریک نے عوام اور نوجوانوں کے دماغوں پر اس قدر غلبہ پا لیا کہ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے اشتراکی خیالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کے بعد اب تک حکومت کی دار و گیر اور خود کانگرس کی مخالفانہ روش کے باوجود سوشلزم کو نوجوان طبقہ میں روز افزوں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور اس سے وہ لوگ بھی غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہے ہیں جو سوشلزم کے باقاعدہ معتقد نہیں۔ اب کارل مارکس کا نظریۂ اقتصاد ڈارون کے مسئلہ ارتقا کے بعد دنیا کے سب سے بڑے موثرات ادب میں سے سمجھا جاتا ہے۔

ہمارا موجودہ ادب اور افسانہ ان ہواؤں اور فضاؤں کی پیداوار ہے۔ ملک کی سیاسی کشمکش نے نوجوانانِ ملک کو آزادی اور استقلال کی رمز سے آشنا کر دیا ہے۔ اور اب ادیبوں

کا کثیر گروہ تقلید اور اندھی پیروی کے بجائے نئے نئے موضوع تلاش کر رہا ہے۔ گذشتہ صدی میں جو مغربی نظریے ملک میں رواج پا چکے تھے۔ اب ان پر تنقید کی نظر ڈالی جا رہی ہے اور ان کو مقامی ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا رہا ہے۔ روسی واقعیت نے نوجوان مصنّفین کو بے کار ادب سے ہٹا کر قوم کے بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ بلاشبہ روحانی بے اطمینانی اب بھی موجود ہے اور ذہن اب بھی مسائل اخلاق کے متعلق کشاکش میں مصروف ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب ہمارے ادیب زندگی کو اس کے ماحول کے تعلق سے دیکھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

ہندوستان میں ہماری بنیادی ضرورتیں کیا ہیں؟ غلامی کا خاتمہ، بے کاری اور افلاس کا علاج اور نوجوانان ملک کو مقابلۂ زیست میں کامیاب بنانے کے لئے جد و جہد میں مصروف رہنے کی تلقین۔ سیاسی غلامی۔ اقتصادی بد حالی اور روحانی طور پر ایمان وایقان کی کمی نے قوم کے ایک بڑے حصّے میں مُردہ دلی، افسردگی اور بے اعتمادی کے امراض پیدا کر دیئے ہیں جس سے عام یاس اور قنوط، عزم وہمّت کی کمی اور خود غرضی ونفس پروری ہر جگہ غالب آ رہی ہے۔ چنانچہ ہزاروں اور لاکھوں نفوس آج وہی کچھ سوچتے ہوں گے۔ جو "قدرت کی گود میں" نعیم نے سوچا:

"وہ سوچنے لگا۔ زندہ رہنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ طبیعت کی جولانی اور دل کی شگفتگی کو ہاتھ سے نہ دینا بھی کتنا بڑا کام ہے اور زندگی کی جد و جہد میں ہمیشہ سربلند وگردن کشاں رہنا بھی کیسی کٹھن منزل ہے۔"

زندہ رہنا، طبیعت کی جولانی اور دل کی شگفتگی کو ہاتھ سے نہ دینا اور زندگی کی جدوجہد میں ہمیشہ سربلند و گردن کشاں رہنا بھی تو وہ معرکتہ الآرا مسائل ہیں جن سے ہماری نئی نسلیں دوچار ہیں اور جن کے حل کرنے میں ہمارا سنجیدہ فکر طبقہ مصروف ہے۔ افسانوں کا موجودہ مجموعہ (راہگذر) بھی بعض ایسے ہی امور و معاملات کے تجزیہ و تحلیل کی ایک دردمندانہ کوشش ہے۔

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ موجودہ دور میں ہندوستان میں طبقاتی احساس بہت تیز ہوا۔ اس زمانے میں کسانوں اور زمینداروں، غریبوں اور امیروں، سرمایہ داروں اور محنت کشوں جاگیرداروں اور کاشتکاروں کے درمیان ایک ایسی کشاکش نظر آتی ہے جس کے اثرات سے ہمارا ادب کسی حالت میں مصئون نہ رہ سکتا تھا۔ تعلیم یافتہ بے کاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس مسئلے کو پیچیدہ تر بنا رہی ہے۔ ہزاروں گریجوایٹ جو کالج کے چھ سات سال سہانے خواب دیکھ دیکھ کر گذارتے ہیں۔ جب یونیورسٹیوں کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہیں۔ تو بے کاری اور بے روزگاری اُن کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہوتی ہے۔ دربدر مارے مارے پھرنے اور اُمراء اور سرمایہ داروں کے سامنے جبیں سائیوں کے بعد بھی جب محرومی شامل حال رہتی ہے تو دنیا ان کی نظروں میں باوجود ہزاروں وسعتوں کے تنگ ہو جاتی ہے۔ زندگی کی یہ تلخی اور بھی تیز اور تند محسوس ہوتی ہے۔ جب غریبوں اور بے زروں کے پہلو بہ پہلو اور دیوار بہ دیوار اُمراء اور ذی ثروت حضرات گلچھرے اڑاتے نظر آتے ہیں۔ اور عیش و عشرت

ہیں روپیہ اس فراوانی کے ساتھ لٹایا جاتا ہے کہ اس منظر کو دیکھنے کے بعد سعید[1] جیسا بے زر شخص

"کیونکر باور کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں باشندے تن ڈھانکنے کو چند گز کپڑے اور پیٹ بھرنے کو روٹی کے چند ٹکڑوں سے محروم ہیں اور اس خطۂ ارض پر بسنے والے بے شمار انسان محض افلاس کے ہاتھوں قبل از وقت موت کی نذر ہو رہے ہیں۔"

"اگر یکایک کسی طلسمی طاقت سے مال کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی اُن درماندہ مفلوک الحال اور خستہ و نیم جان بستیوں کا نقشہ بھی سامنے آجائے تو یہ عشرت پسند اور نازک مزاج لوگ جو سات ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے کے باوجود بے چین راتیں بسر کرتے ہیں۔ اُن آبادیوں کو دیکھ کر کیا کہیں گے۔ جہاں عورتیں پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں جسم چھپائے، تپتی ہوئی دوپہر میں پتھر اُٹھا اُٹھا کر مزدوری کرتی ہیں اور ننھے ننھے شیر خوار بچے پاس زمین پر پڑے دودھ کے لئے بلبلاتے ہیں۔ جہاں قحط زدہ، فاقہ کش اور مجبور و لاچار مزدوروں کی برہنہ پشت پر اس لئے کوڑے برستے ہیں کہ انہوں نے کسی جاگیر دار کے کارندے سے کام کی اُجرت طلب کی تھی۔"

---

[1] "روشنی کی کرن" کا ہیرو

ہمارے دوست عاشق صاحب نے "روشنی کی کرن" میں سعید کی وساطت سے ملک کی بدحالی اور بے چینی، سرمایہ دار اور دولت مند کی عیاشی اور نشاط کوشیوں کی جو داستان بیان کی ہے۔ وہ بے حد حقیقی اور موثر ہے۔ عاشق کے افسانوں میں یہ طبقاتی احساس ہر جگہ نظر آتا ہے۔ وہ امیر اور غریب کی زندگی کے تفاوت کو ہر جگہ نمایاں کرتے ہیں اور ان دونوں طبقوں کے ذہن کی باطنی کارفرمائیوں پر خنی الوسع روشنی ڈالتے ہیں۔ "روشنی کی کرن" میں سعید کی بیوی ایک بلند پایہ، صاحبِ ثروت اور جاہ پسند خاتون ہے۔ اس کی شانِ خود آرائی کا یہ عالم ہے کہ

"عام لوگوں کے مذاق کی ہم نوائی کرنا یا ان کی سطح پر رہ کر زندگی گزارنا اپنے خاندانی وقار کے خلاف سمجھتی تھی"۔

اسی طرح آصف

"عمر بھر میں جوں جوں بڑھتا گیا۔ اس کے اندر یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ وہ ایک رئیس زادہ ہے اُسے عام لوگوں سے ملنے جلنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے نشست و برخاست میں ایسا سلیقہ پیدا کرنا لازم ہے جو صرف اُمرا کے لئے مخصوص ہے"۔

عاشق صاحب کے عام افسانوں کا موضوع ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ترجمانی کرنا ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر زندگی کی جد و جہد میں ابھی ابھی گامزن ہوتے ہیں اور پہلے ہی قدم پر زندگی کی مشکلات و مصائب سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ افسانے جس دورِ اختلال کی پیداوار ہیں اس کے اندر بدسا کھی، بے اعتمادی، فطرتِ انسانی

سے نفرت، معاشی اخلاق کا انحطاط خاص طور پر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ معاملاتِ انسانی کے اقدار اور ان کے معیار اس درجہ تذبذب کا شکار اور بے یقینی سے پامال نظر آتے ہیں کہ ایک صاحبِ فکر اس نظامِ عالم کے قیام و بقا کے متعلق بہت کچھ شبہ میں پڑ جاتا ہے۔ دراصل ہندوستانی تہذیب اب جس قالب میں ڈھل رہی ہے۔ وہ بجائے خود ناپختہ، نااستوار اور خام ہے کہ اس کے قوام اور خمیر میں ہمیں وہ محکمیت اور مضبوطی نہیں ملتی۔ جو ایک پختہ تہذیب کا ثمر ہوتی ہے۔ یہ دوغلا تمدّن اور اس سے پیدا شدہ ضابطۂ اخلاق بہت سی ذہنی دشواریوں اور اُلجھنوں کا باعث ہو رہا ہے۔

تعلیم یافتہ گروہ کی اقتصادی بے چینی اور معاشی اخلاق کے زوال کا بہترین مرقع "چار یاری" میں کھینچا گیا ہے۔ جمالیؔ، بدر الحسنؔ، رسواؔ اور ڈاکٹر یزدانی چار دوست ہیں۔ جمالیؔ ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ بدر الحسنؔ ایک سکول کے مدرس، مشتاق علی رُسواؔ اخبار نویس اور یزدانی ڈاکٹر ہیں۔ ان چاروں حضرات کو اپنے اپنے وسیلہ معاش کے متعلق بے اطمینانی ہے۔ وہ خلوص اور بے نفسی جو فنِ طب کے ساتھ مخصوص ہونی چاہیئے۔ اب اس فنِ شریف سے رخصت ہو چکی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر یزدانی کو یہ دعویٰ ہے کہ "میں طب جیسے شریف اور معزز فن کو دکانداری بنانا گناہ خیال کرتا ہوں" لیکن اس کی گفتگو کے بین السطور سے جذبۂ اخلاص غائب نظر آتا ہے۔ جمالیؔ تو تھے ہی بیمہ کے شکاری یا لوگوں کو موت کا خوف دلا کر روپیہ کمانے والے۔ ان کی کاروباری زندگی کیا بہتر ہوتی۔ رہے اخبار نویس اور مدرس سو

وہ کبھی اپنے ذریعۂ معاش سے مطمئن نہیں ہوئے۔

راہگذر کے افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عاشق بھی مغرب زدہ نوجوانوں سے بہت کچھ مایوس ہیں اور ان کو ہندوستانی سوسائٹی کے لئے مفید نہیں خیال کرتے۔ یہ مغرب پرست نوجوان یورپ کی نقالی میں اس درجہ سخافت کا ثبوت دیتے ہیں کہ دیسی ماحول میں ان کی اجنبیت بے حد نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ "فریبِ خیال" کے ہیرو، محمد ہارون شبیا ایک گریجوایٹ ہیں۔ جو سماج کے پرانے نظام اور اس کے بنائے ہوئے رسوم وقواعد کے سخت مخالف ہیں۔ وہ پامال روش پہ چلنے سے اس قدر نفور ہیں کہ لباس، ذوق، گفتگو، طرز ماندوبود اور دیگر تمام اطوار وعادات میں اپنے لئے ایک نادر اور الگ روش نکالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "لکیر کا فقیر بنے رہنے سے انسان کی اجتہادی قوتیں بروئے کار نہیں آسکتیں"۔ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "رسمیاتِ عہد کی پابندی صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اپنی انفرادی شخصیت کے شعور سے محروم ہیں"۔ ان کے نزدیک مذہب "چند بے جان رسوم کا نام ہے۔ جنہوں نے انسان کے ہوش وحواس پر اس طرح قبضہ جما رکھا ہے کہ غور وفکر کی تمام صلاحیتیں سلب ہوگئی ہیں"۔ شبیا صاحب کے نزدیک مذہب ہماری سیاسی غلامی کا ذمہ دار ہے۔ وہ پیٹ کی ضروریات کو مؤخر اور قلب ودماغ کی ضروریات کو مقدم سمجھتے ہیں۔ اور شائستہ زندگی کے لئے فنون لطیفہ کی تربیت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ سماج سے بغاوت کا جذبہ ان میں اتنا شدید ہے کہ وہ شادی

کے معاملے میں نکاح کو لازمی نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ جب دو دل مل جائیں تو پھر کسی بے معنی رسم کے ادا کرنے کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے۔" وہ کسی اور کی منکوحہ سے اس بنا پر عشق کرنا جائز سمجھتے ہیں کہ وہ بندھن نا موزوں ہے اور ان کی باہم رفاقت ناممکن۔ ایک جاہل خاوند کو ایک شائستہ لڑکی پر قبضہ جمائے رکھنے کا کیا حق ہے۔

درحقیقت شیدا صاحب کے جو خیالات ہیں وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان ہزاروں نوجوانوں کے خیالات کی جو آج کل ہارڈی اور آسکر وائلڈ، جیمس جوائس اور ڈی ایچ۔ لارنس کے خیالات سے سرشار ہو کر رزمگاہ جہان میں نکلتے ہیں۔ یورپ کے اعلیٰ افکار اور بظاہر پرمسرت زندگی سے متاثر ہو کر وہ اپنی دنیا کو بے کیف اور بے سوز پاتے ہیں اور اپنے ماحول کا خیال نہ کرتے ہوئے ضابطہ و رسوم کی ہر قید سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر آلام و افکار میں مبتلا ہو کر یا خودکشی کر لیتے ہیں یا زندانوں کی کال کوٹھڑیوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

اگرچہ حضرت عاشق کو ان نوجوانوں کے جذبات سے یک گونہ ہمدردی ہے لیکن راہگذر کے مصنّف کے خیالات میں وقت کے ساتھ ساتھ ایک حد تک اعتدال آگیا ہے۔ وہ سماج کے مروجہ قوانین کے خلاف اس بے محابا بغاوت کو سراسر فریب خیال تصور کرتے ہیں۔ شیدا صاحب بھی اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اسی "فریب خیال" میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اسی جنون بغاوت میں ایک شخص کی

بیوی سے عشق کیا اور اغوا کے جرم میں گرفتار ہو کر مصائب کا شکار ہو گئے۔ آخر لبعداز ہزار خرابی مستغیث سے راضی نامہ ہوا اور مقدمہ عدالت سے واپس لیا گیا۔

"اب شیدا صاحب نہایت چپ چاپ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بہت کم بولتے ہیں۔ سماج کے خلاف بغاوت کے آثار ان میں نظر نہیں آتے۔ سنا ہے کہ لاہور کو خدا حافظ کہنے کا ارادہ کر رہے ہیں"۔

راہگذر کے بیشتر افسانے مسائل محبت کی اسرار کشائی کرتے ہیں۔ عشق اور شادی کا موضوع ہمیشہ سے ایک لاینحل عقدہ چلا آتا ہے۔ عورت اور مرد کی فطرت ہنوز ایک راز سربستہ ہے جس کی نقاب کشائی کی کوشش میں ادیبوں، شاعروں اور حکیموں نے ہزاروں اوراق سیاہ کر دئیے ہیں لیکن ابھی تک یہ ایک معمہ ہے جس کو بوجھا نہیں گیا ؎

کس ماجرائے بلبل و پروانہ حل نکرد
سرگشتہ ماند ہر کہ بایں ماجرا رسید (نظیری)

یورپ میں عورت کی فطرت کا مسئلہ صدیوں سے موضوع بحث چلا آیا ہے۔ ہندوستان میں جب سے قصوں اور افسانوں کی ابتدا ہوئی ہے ہمارے ادب میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ توجہ ہوتی رہی ہے۔ عورت کے متعلق ہمارے افسانہ نویس دو مستقل گروہوں میں منقسم رہے ہیں پہلے گروہ میں نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری ہیں، جنہوں نے ایک زنانہ ادب لطیف کی بنیاد رکھی۔ ان حضرات کے نزدیک عورت

محترم ترین مخلوق، ہم پر حکمرانی کرنے والی، ایک لذت ہے مجسّم، ایک تسکین ہے مشکل، ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادّی"۔

ان کے نزدیک عورت کا حسن صرف دیکھنے کے لئے ہے" آزاد، رمیدہ، آغوش سے دور"۔ مجنوں کہتے ہیں "محبت بلا ازدواج قائم رہ سکتی ہے، اس میں مذہب وملت کی تفریق بھی بے مقصد ہے، مرد صرف عورت کو چاہتا ہے"۔ قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط میں مرد کو مجرم اور عورت کو معصوم قرار دیا ہے۔

ہمارے افسانہ نویسوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو عورت کو بدی کا مجسّمہ قرار دیتا ہے اس طبقے کے نزدیک عورت انسانی سیرت کے تاریک پہلوؤں کی محرّک ہے اور اس میں کوئی خوبی نہیں۔

یہ گروہ درحقیقت فلابر اور میری کورلی کے خیالات سے متاثر ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ راہگذر کا مصنّف اپنے موجودہ افسانوں میں افراط وتفریط کے ان راستوں سے یکسو ہو کر فطرت نسوانی کے متعلق ایک متوازن رائے پیش کرتا ہے "خوشبودار خط" کا ہیرو اشفاق عورت پر ایک اعتراض کے سلسلے میں کہ عورت بے وفا اور ریاکار ہوتی ہے۔ یہ سوال کرتا ہے کہ "میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ عورت محبت کے معاملے میں مرد کو کیونکر بے وقوف بنا لیتی ہے"

"عورت اور مرد دونوں تعلیم یافتہ ہیں - دونوں جدید معاشرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور دونوں نے مشرق ومغرب کے اتصال سے جو خوبیاں یا برائیاں

پیدا ہوئی ہیں، اختیار کر رکھی ہیں۔ مرد سب کچھ جان بوجھ کر دیکھ بھال کر عورت سے محبت کرتا ہے اور عورت اُسے دھوکا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتی ہے۔ کیا مرد ایسا ہی معصوم اور عورت ایسی ہی فریب کار ہے؟"

حضرت عاشق کے نزدیک فطرت نسوانی کا یہ نظریہ غیر معتدل ہے بلکہ درحقیقت۔ "عورتیں نیک بھی ہوتی ہیں اور بد بھی۔ اسی طرح مرد شریف بھی ہوتے ہیں اور مکار بھی۔ افسانہ نگار نے فلم میں ذاتی خیالات و تجربات کا اظہار کیا ہے اور ہم غلطی سے اُسے عالمگیر صداقت سمجھ رہے ہیں عشق و محبت کی دنیا میں ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اور جب اس تجربے کو رنگ آمیزی کے ساتھ ایک کہانی کی شکل میں بیان کیا جائے تو لوگ اُسے اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے کہ وہ محض ایک شخص کی ذاتی روداد ہے بلکہ وہ اُسے ایک مسلّمہ حقیقت یقین کر لیتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ حضرت عاشق اس اعتدال کے باوجود نسوانی نفسیات کے پیچیدہ اسرار کو حل کرنے سے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کہیں کہیں دبی زبان سے عورت کی سرد مہری اور بے وفائی کا مرثیہ بھی پڑھ دیتے ہیں لیکن وہ رزمگاہِ حیات میں عورتوں اور مردوں کو اپنی اپنی خامیوں اور اپنی اپنی لغزشوں کے لئے مطعون کرتے ہیں اور کسی ایک صنف کو شرِ محض اور خیرِ محض نہیں خیال کرتے۔ "روشنی کی کرن" میں گرچہ زبیدہ — معصومیتِ کردار اور پاکیزگیٔ خیال کی مجسمہ زبیدہ — سعید سے در پردہ محبت کرنے والی زبیدہ ایک دوسرے شوہر کی بیوی بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا قلب سعید

کی محبت میں تڑپتا رہتا ہے۔ اور اس کی وفا اس کو حیات بعد الموت میں بھی استقامت کا پیغام دیتی ہے:۔

"زبیدہ نے اس کو سعید کو یقین دلایا کہ دل میں جب ایک مرتبہ شوق کی آگ بھڑکتی ہے تو بجھتی کبھی نہیں چنگاریاں راکھ کے اندر دبی رہتی ہیں اور دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ تنور ٹھنڈا ہو گیا۔ سمندر بظاہر پرسکون نظر آتا ہے لیکن سطح کے نیچے شورش و اضطراب کا ایک محشر بپا ہوتا ہے۔ آؤ ہم اس وقت عہد کریں کہ شوق کے ان دھاروں کو خاموشی سے بہنے دیں گے۔ ان میں طوفان کا آنا اچھا نہیں۔ اس دنیا میں تو ہم آپس میں مل نہ سکیں گے لیکن ایک زندگی اور بھی ہے جہاں اس دنیا کے رسم و رواج کی حکومت نہیں"۔

یہ واقعہ نہیں سماج کے رسم و رواج کے خلاف ایک پُر زور احتجاج ہے جس کے جابرانہ نظام نے زبیدہ کی ہمت اور اولوالعزمی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ زبیدہ — وہ جذبات کی مخلوق جو مصلحت کو خس و خاشاک کی طرح جلا سکتی ہے — محض اس لئے پند و نصائح پر اتر آتی ہے کہ وہ رسم و رواج کے ہاتھ میں اسیر ہے۔ یہ حضرت عاشق کی اپنی بجھی ہوئی طبیعت کا انعکاس ہے۔ یا رفتارِ عمر کے ساتھ ضبط و تنظم کے احساس کے تیز ہو جانے کا نتیجہ کہ ان کی زبیدہ آئندہ زندگی کے مرقعے دکھا دکھا کر سعید کی دلجوئی کرے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

میں بدگمانی نہیں کرتا لیکن میرے خیال میں یہ عورت کی سیرت پر ایک چھپا ہوا

حملہ ہے سوسائٹی اور اس کے رسوم کے ضبط کو قائم رکھنے کے لئے زبیدہ نوراضی بہ رضا اپنے شوہر کے ہاں جبتی ہے لیکن سعید کی اولوالعزمی کی یہ شان ہے کہ محض اس اقرار سے کہ زبیدہ کو اس سے محبت ہے۔ وہ مطمئن ہو کر روشنی کی کرن پا لیتا ہے۔

از یک نگاہ لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

عاشق کے افسانوں میں محبت کی ناکامیوں اور نامرادیوں کو دیکھ کر یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ عشق واقعی ایک مرض ہے جس کے مریض کبھی شفایاب نہیں ہوتے۔ خیر محبت تو ایک جذبۂ لطیف ہے جو باہمی اتصال کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے لیکن عشقیہ شادیاں جو ہندوستان میں مفقود ہیں۔ ناکامی اور نامرادی پر منتج ہوتی ہیں۔ فردوس اپنے ٹیوٹر نعیم سے محبت کرتی ہے۔ اسی جوش محبت میں فردوس اپنے ٹیوٹر کو اس کے اغوا پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن جب یہ لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں تو فردوس اپنی والدہ کے آنسوؤں کو دیکھ کر نعیم کی سب قربانیوں کو بھول جاتی ہے اور اس کو قید کرا کے اپنے والدین کے ساتھ شریک ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں جہاں فردوس کے والدین کی ناروا سختی کا اظہار ہوتا ہے وہاں فردوس کی بے وفائی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

عاشق صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو شوپنہار کی طرح شادی کو ایک بدرسم خیال کرتے ہیں۔ اس فلسفی کا مقولہ ہے کہ "شادی صرف فلسفی کا حق ہے لیکن فلسفی شادی نہیں کرتے"۔ مگر یہاں پھر ہم "سوز ناتمام" کے مصنف کو قدیم شاہراہ سے ہٹ کر

جدید "راہگذر" پر چلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ "خوشبودار خط" میں اشفاق کی یہ رائے کتنی سنجیدہ اور عملی معلوم ہوتی ہے۔

"ہماری معاشرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک خاص عمر پر پہنچ کر ہر مرد کو سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہیئے ورنہ اس کے بعد ناکتخدا رہنے والوں کو سوسائٹی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے ..... مگر شادی شدہ شخص کو سوسائٹی نیک چلنی کا پروانہ دے دیتی ہے .... گویا عزت و اعتبار اور قدر و منزلت کے حصول کا بہترین ذریعہ شادی ہے۔"

بایں ہمہ عورت کی نفسیات کے متعلق عاشق صاحب کا نظریہ یہی ہے کہ اس کا سمجھنا محال ہے۔ چنانچہ سعید زبیدہ کی شادی کے موقعہ پر جو تحفہ بھیجتا ہے۔ وہ فطرت نسوانی کا ایک پر معنی استعارہ ہے۔

"یہ ایک عورت کا خوبصورت مجسمہ تھا۔ جو سنگِ مرمر سے تراشا گیا تھا۔ عورت کے ہاتھ میں سورج مکھی کا پھول تھا۔ جس پر آفتاب کی شعاعیں پڑ رہی تھیں اور خود عورت کا وجود سراسر تاریکی میں تھا۔"

عاشق صاحب نے شادی کے موضوع پر بہت غور کیا ہے۔ وہ ہندوستان میں منزلی زندگی کی اُلجھنوں کا حل تلاش کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ ہماری موجودہ دوغلی تہذیب میں شادی کا سوال ہزار چند پیچیدہ ہو گیا ہے۔ جس سے نوجوانانِ وطن اکثر سراسیمہ رہتے ہیں۔ لڑکیاں جس ماحول میں پرورش پاتی ہیں۔ اس کی قید اُن کی نفسیات

میں بعض ایسی خامیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ جن کا اثر ان کی زندگی میں تا ابد باقی رہتا ہے۔ اس سلسلے میں والدین کی جانب سے جو مضحکہ انگیز طرز عمل برتا جاتا ہے۔ وہ اس سوال کی دشواریوں میں بے حد اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ فردوس ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس کو کسی حد تک مقیّد ماحول میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن پردہ کے حامی والدین اس لڑکی کو جسے تنوّع کی آرزو اکثر تڑپایا کرتی ہے۔ ایک مرد ٹیوٹر کی تعلیم و تربیت کے سپرد کرتے ہیں۔ اس کے بعد قدرتی طور پر دو نوجوانوں کے اجتماع کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ فردوس نعیم کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اس کے بعد وہی والدین ان کو گرفتار کرا کر نعیم کو سزا دلواتے ہیں۔ فردوس کے والد کی یہ قابل افسوس ذہنیت "کج دار و مریز" کے فلسفے کے مترادف ہے جس میں ایک طرف پردے کی پابندیاں ہیں اور دوسری طرف مرد ٹیوٹر کی تربیت۔

جمیلہ کا باپ آصف کے ہاں آتا ہے۔ وہاں جمیلہ اور آصف کا میل جول ہوتا ہے دونوں طرف ابتدائے شباب کی امنگیں طوفان اٹھاتی ہیں۔ آصف کا دل جمیلہ کے رشتۂ محبت کا اسیر ہو جاتا ہے اور اگرچہ جمیلہ کو حال دل کہنے کا حق حاصل نہیں لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی آصف کے کمندِ عشق کی گرفتار ہوئی ہو گی۔ ان حالات میں جمیلہ کے بڈھے باپ کی معاشرتی حماقت کی۔ اس سے بڑھ کر کیا انتہا ہو گی کہ وہ آصف کو رشتہ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ جانتا ہے کہ آصف اور جمیلہ باہم مل چکے ہیں اور آصف اس کو تحائف بھی دے چکا ہے۔

ہمارے معاشرتی اور مجلسی نظام کے بدلتے ہوئے نظریات ابھی تک ابہام اور لایقینی کے دور سے گذر رہے ہیں۔ جس میں پرانی نسل کے لوگ گذشتہ روایات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک طرف پرانا ماحول قایم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف نئی ضروریات اور فضاؤں میں رہنے کی وجہ سے نئی نسلوں کو نئے اثرات سے محفوظ بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس کا نتیجہ ہے بدنظمی، اختلال اور پریشانی۔

عاشق صاحب نے شادی کی کامیابی کا ایک راز دریافت کیا ہے، اور وہ ہے مرد عورت کے نظریات زندگی کی ہم آہنگی۔ لیکن یہ کیسے پیدا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے:۔

"زندگی کے متعلق جب دونوں کے نظریے ہم آہنگ ہو جائیں یا اگر اختلاف بھی ہو تو اتنا جتنا موسیقی کے دو سُروں میں ہوتا ہے تو دل و دماغ کی شگفتگی کے لئے یہ صحبت کتنی مؤثر و مفید ہوتی ہے۔ خیال اور مذاق کی یگانگت سے ہمدردی اور ہمدردی سے محبت پیدا ہو جایا کرتی ہے"۔

راہگذر کے افسانے جس حد تک عاشق صاحب کے خیالات کی ترجمانی کر سکتے ہیں اُن سے نہ صرف ہمارے موجودہ نظام معاشرت کی ناکامی و نامرادی کا ترشح ہوتا ہے بلکہ خود محبت، عورت سے محبت ہی ایک حسرت انجام فعل معلوم ہوتا ہے۔ راہگذر کے اکثر افسانوں میں عورت کی محبت کا انجام ناکامی اور تلخی ہے۔ "روشنی کی کرن" میں سعید اور زبیدہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن قدرت نے ان دونوں کے درمیان ایک آہنی دیوار حائل کر دی ہے۔ سعید کا محض محبت بھرے الفاظ سے مطمئن ہو جانا

میرے نزدیک حضرت مصنف کے تخیل کی پرواز ہے ورنہ محبت والا دل ان باتوں سے راضی نہیں ہو سکتا۔ "خوشبو دار خط" میں اشفاق کی سادہ لوحی اور شمشاد کی عیاری وہی محبت کے اندھاپن کا ثبوت ہے۔ "قدرت کی گود میں" فردوس کی بے مہری بلکہ دغا بازی نے نعیم کو خانماں برباد کر دیا۔ یہاں پھر مصنف نے واقعیت سے ہٹ کر نعیم کے لئے ایک جھوٹے اطمینان کا وسیلہ پیدا کیا ہے۔ وہ انسانوں سے مایوس ہو کر فطرت کے خزانوں کے انمول موتی سمیٹتا ہے۔

"جب تک قدرت کے حسین مناظر دست بستہ خدام کی طرح اس کا دل بہلانے کو حاضر ہیں وہ کیسے غمگین رہ سکتا ہے جب تک چاند کی پاکیزہ روشنی اس کی روح کی خلوتوں کو منور کرنے کے لئے موجود ہے اس کا ظاہر و باطن کیونکر تاریک رہ سکتا ہے....."

"جوانی کا خواب" میں آصف خودکشی کرتا ہے۔ "تیر دلبراں" کا ہیرو فیاض اپنے ہی نشتر سے ہلاک ہوتا ہے۔ "فریب خیال" کا دیوانہ شیدا اپنے "باغیانہ خیالات" کی سزا بھگتتا ہے۔ "زندگی کی صبح" میں جگدیش اور رسو شیلا دونوں کے ساتھ محبت کا دیوتا ایک عجیب ظالمانہ مذاق کرتا ہے۔

عاشق صاحب حقیقی خوشی (بلکہ عارضی تسلی) کے لئے بھی ضبط نفس کی ضرورت کے قائل ہیں اور انگریزی شاعر پوپ کے ہم نوا ہو کر یہ کہتے ہیں کہ

Order is the Heaven's first law

ان کے نزدیک مجلسی نظم اور معاشرتی اطمینان حاصل کرنے کے لئے جہاں بڑے بوڑھوں کو فراخ حوصلگی پیدا کرنی چاہیے۔ وہاں نئی نسلوں کا فرض ہے کہ وہ کسی حد تک ضبط نفس سے کام لے کر سوسائٹی کی ہم آہنگی اور وحدت کو نہ بگاڑیں۔ فریبِ خیال میں یہ سبق نہایت واضح اور بیّن طور پر سکھایا گیا ہے۔

حضرتِ عاشق کا عام نظریۂ زندگی حزنیہ ہے۔ اُن کے نظامِ فکر میں بے آمیز خوشی موجود ہی نہیں۔ دنیا ـــ خصوصاً محبت کی دنیا ـــ ایک غمکدہ ہے۔ ایک ماتم سرا ہے۔ جیسا کہ شوپنہار کا خیال تھا انسانی بصیرت اور حقائق اشیا کا علم جس قدر کسی شخص کو زیادہ ہوگا اُسی قدر اُس کا غم بھی زیادہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ راہگذر کے افسانوں کا غالب حصّہ غم پر ختم ہوتا ہے یہ درست ہے کہ بعض افسانوں میں ظرافت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ لیکن ان میں بھی مصنّف چیخوف کی طرح ہنسا کر حقائق کو ذہن نشین نہیں کرتا بلکہ اُس کے تبسّم کی ہلکی سطح کے نیچے ایک دبی ہوئی مایوسی اور چھپی ہوئی افسردگی دکھائی دیتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان افسانوں میں بھی ظرافت سے کہیں زیادہ طنز اور انبساط سے کہیں زیادہ استعجاب ہے۔ آموں کی فصل۔ پہاڑ کی سیر الف لیلہ کی ایک رات، نئی زندگی کی تلاش، روحوں کا تماشا، چار یاری سب کے سب اسی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔

اگر یہ غلط نہیں کہ تحریر عموماً شخصیت کی عکاسی کرتی ہے تو راہگذر کی تحریریں بھی ہمارے ذہن میں مصنّف کی ہو بہو تصویر پیش کرتی ہیں۔ ان افسانوں میں مصنّف ایک ذہین، خوش گفتار اور بذلہ سنج شخص نظر آتا ہے جسے محفل آرائی اور مجلسی گفتگوؤں میں زندگی کا لطف

حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لئے دنیا میں دوستوں کی ملاقات ہی ایک ایسا سرچشمہ راحت ہے جس کی سیرابی سے وہ غمِ ایام کو دُور کرتا ہے۔ ہم نشینوں اور ہم مذاق لوگوں کیساتھ ادبی نوک جھونک سیاسی بحث و تمحیص اور مکالمہ و مباحثہ اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ رہگذر کو پڑھ کر مؤثر ترین نقش جو ہمارے لوحِ دل پر بیٹھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوستی اور دوست داری ہمارے مصنف کے نزدیک زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے جس کے بغیر تکمیل حیات ممکن نہیں۔

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی

بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

عاشق کے بیشتر دوست مقامی ہیں ان میں امیر بھی ہیں غریب بھی، آزاد اور بے فکرے بھی ہیں اور متین اور فرض شناس بھی —— وہ سب کے ساتھ اُن کے پایۂ علم کے مطابق گفتگو کرتا ہے اور کبھی ان کے نظریے سے مغلوب اور کبھی ان کے نظریے پر غالب آتا ہے۔

رہگذر میں عاشق صاحب نے مقامی رنگ کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے یہ افسانے دراصل لاہور اور پنجاب کی متوسط درجے کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کی تصویریں ہیں۔ ہمارا مصنف اگرچہ مولداً لاہور کا باشندہ نہیں لیکن تعلیم و تربیت اور دیگر اوضاع و اطوار کے اعتبار سے اس کے فکر و عمل کا دائرہ لاہور ہی ہے۔ گذشتہ تیس چالیس سال کے اندر لاہور میں کالجوں اور تعلیم گاہوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ اب لاہور ایک بیت العلم اور دار الحکمتہ بن گیا ہے۔ یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ لاہور کی حقیقی رونق ان ہزاروں طالب علموں کے دم سے ہے جو کالجوں اور یونیورسٹی

کے مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لاہور میں جمع ہیں اور جن سے انار کلی اور لارنس، پلازا اور نشاط، لبِ راوی اور شالامار کی زینت قائم ہے۔ سرِ شام فوق الطھڑک لباس میں ملبوس، جوق در جوق اُن کی ٹولیاں جب گلگشت کے لئے نکلتی ہیں تو ہر طرف ایک چہل پہل، ایک شان، ایک ہنگامہ نظر آتا ہے۔

جس طرح اٹھارھویں صدی عیسوی میں یورپ میں قہوہ خانوں نے وہاں کی ادبی اور تمدنی تحریکوں پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بعینہٖ اسی طرح اِس وقت لاہور کے ہوٹل سیاسی و علمی و ادبی مبادلۂ خیال کا مرکز بن رہے ہیں۔ جن میں ادیب اور مصنف سرِ شام جمع ہوتے ہیں اور واقعات حاضرہ پر بحث و تمحیص کرتے ہیں۔ "چار یاری" اور "ستمِ دلبراں" میں ہمارے مصنّف نے لاہور کی زندگی کے جو مناظر پیش کئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر راقم الحروف کے تصور میں عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری کی مجالس کے وہ تمام نظارے پھر جاتے ہیں جن میں حضرتِ مصنّف اپنے احباب اور دوستوں کے گروہ میں اکثر مصروف تکلم نظر آیا کرتے ہیں۔ راہگذر کا افسانہ "چار یاری" پڑھ کر وہ لوگ حضرتِ عاشق کی حقیقت نگاری اور منظر کشی کی داد دیں گے جو اسلامیہ کالج کے بالمقابل عرب ہوٹل کی ہنگامہ پرور علمی و ادبی مجلسوں سے واقف ہیں۔ 'چار یاری' کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:۔

"ہوٹل میں تقریباً ہر روز شام کے کھانے کے بعد ایک لمبی نشست ہوتی تھی بعض لوگ کھانا کھا کر یوں ہی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے تھے۔ کبھی کبھی سامنے کالج کے ہوسٹل سے طلبہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں آکر بیٹھ جاتے تھے یہ صرف چلے

پیتے یا ہماری باتیں سنتے تھے۔ اس بات کا احساس کہ وہ اپنے ہم عمر و ہم مکتب ساتھیوں کی گفتگو میں نہیں بلکہ جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ لوگوں کی مجلس میں شریک ہیں ان کے اندر ایک خاص برتری کا جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔ شام کی یہ محفل ہوٹل کی معاشرتی زندگی کا ایک ایسا نمایاں اور دلآویز پہلو بن گیا تھا کہ اس کی ہنگامہ خیز رونق ہمارے لئے کھانے سے زیادہ ضروری تھی۔"

راہگذر میں جدید لاہور یعنی وہ شہر جو میونسپل کمیٹی کے باغات سے باہر کھڑا ہے ——— کی زندگی کے مناظر بکثرت ہیں۔ "قدرت کی گود میں" لارنس باغ کے دلآویز مرقعے کس خوبصورتی سے پیش کئے گئے ہیں جن کو پڑھ کر پہروں لارنس بن سیکھے آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے۔ قدیم لاہور بھی جو سرکلر روڈ کے اندر آباد ہے۔ عاشق صاحب کی تصویر کشی سے نہیں بچا۔ "سِرِ دلبراں" میں لاہور کے اصلی باشندوں کے اطوار، اُن کی عادتیں، اُن کا لب و لہجہ، اُن کی تمدنی خصوصیتیں اس خوبصورتی سے بیان ہوئی ہیں کہ "سِرِ دلبراں" کو اہل لاہور کی معاشرتی تاریخ کہیں تو بجا ہے۔ راہگذر میں مقامی زندگی کی یہ تصویریں اُس کی اہمیت میں بہت بڑا اضافہ کرتی ہیں۔

راہگذر کی عورتیں تعلیم یافتہ ہیں جو جدید علم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر پردے کی قیود سے آزاد ہیں اور ایک ایسی معاشرت سے متعلق ہیں جہاں مردوں سے عام میل جول کی اجازت ہے۔ زبیدہ ایک قومی خیالات کی لڑکی ہے جو ملک کی غربت اور بدحالی، اقتصادی پریشانی اور سیاسی پستی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ بے پڑھ

ہے لیکن بے پردہ ہو کر اپنے وقت کو قوم وملت کی خدمت میں صرف کرنا چاہتی ہے۔ راہگذر کی عورتوں میں زبیدہ احساس فرض کے معاملے میں ایک مثال ہے ــــ سعید کی بیوی اگرچہ تعلیم یافتہ ہے لیکن امیرانہ فخر و غرور سے اکثر بر خود غلط رہتی ہے۔ وہ مغربی معاشرت کی دلدادہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو ایک "بورژوا" طبقہ کی تعلیم یافتہ لڑکی میں ہو سکتے ہیں۔ "قدرت کی گود میں" نعیم کی والدہ ایک بوڑھی خاتون ہے جس کی زندگی کے تین اصول ہیں۔ غیرت، عزتِ نفس اور خودداری۔ اس عورت کی سیرت میں ہمیں گذشتہ نسل کی بڑی بوڑھیوں کے اخلاق عالیہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ حبیبہ، سوشیلا اور فردوس سادہ لڑکیاں ہیں جو علیہ تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود فطری معصومیت اور پاکیزگی کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ ان سب نسوانی سیرتوں کا زمانی اور مکانی ارتقا، ان کے ذہن کے نشیب و فراز، ان کے جذبات کے مد و جزر اتنے صحیح، اتنے موثر اور اس درجہ دلکش ہیں کہ مصنف ہمیں ان کی سیرت کے جس پہلو کا مداح یا مخالف بنانا چاہتا ہے، ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم اس کے مداح یا مخالف نہ ہوں۔

ہو سکتا ہے کہ خود مصنف کو میرے اس خیال سے اختلاف ہو لیکن میں اپنی اس رائے کے اظہار پر مصر ہوں کہ راہگذر کے مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے مقابلے میں زیادہ مکمل زیادہ پختہ اور زیادہ حقیقی ہیں۔ سعید کا قومی شغف، اشفاق کا ادبی مذاق، نعیم کی پُر جذبات سادگی آصف کی رندی اور عیاشی، فیاض کا ضبط نفس، شیبا کا تکلف و تجمل، جگدیش کا شوق علم۔ غرض جو جس وصف میں ممتاز ہے۔ اس کا وہ وصف پڑھتے پڑھتے دلنشیں ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے مصنف کی سیرت نگاری کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اُسے قیافہ اور چہرے کے

خدوخال کی تصویر کھینچنے اور ان کے اندر چھپے ہوئے جذبات اور تقاضوں کو بیان کرنے میں خاص ملکہ ہے۔ جگدیش کی عزلت پسندی کے ساتھ اس کے جسم کو کتنی مناسبت ہے اور فردوس کی آرزوئے تنوع کے ساتھ اُس کے رُخ و گیسو کو کس درجہ تعلق ہے۔ راہگذر کی سیرتوں میں ظاہر و باطن کی یکرنگی پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے۔

اس مجموعے میں بعض افسانے ایسے ہیں جن میں پلاٹ مفقود ہے۔ دورِ حاضر کے عظیم ترین افسانہ نگار پساں کے بہت سے افسانوں کا انداز یہی ہے۔ ایسے افسانوں میں افسانہ نگار محض ایک خیال کو حقیقت کا لباس پہناتا ہے اور اُسی کے حُسنِ تکمیل سے اپنا کمال دکھاتا ہے۔

عاشق صاحب کے دو افسانے ایسے ہیں جن کو ہم اردو ادبِ لطیف کے بلند ترین شاہپاروں میں شمار کر سکتے ہیں۔ "حورِ صحرا کے نام" اور "کاشانۂ محبوب کو دیکھ کر"۔ ان دونوں میں محض تصویرِ جذبات ہے۔ یہ اس کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب انسان دوست کی بات کہتا جاتا ہے اور نہیں تھکتا۔ وارفتگی کے عالم میں وہ کم و کیف سے بے پروا اور حکایت کی درازی کے خیال سے بے نیاز ہو جاتا ہے وہ قصۂ شوق کو بیان کرتا ہے اور جانتا ہے کہ سامعین تھک جائیں گے اور الفاظ ساتھ چھوڑ جائیں گے لیکن پھر بھی سازِ غم کو ہاتھ سے نہیں رکھتا۔ "کاشانۂ محبوب کو دیکھ کر" اگرچہ اصطلاحی رنگ میں کہانی نہیں لیکن پلاٹ کا فقدان اس کے اثر اور تکمیل کو ضائع نہیں کرتا۔

عاشق صاحب افسانوں میں اتحادِ زمانی و مکانی کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔

اُن کے قصے کا ارتقا قدرتی اور ان کے کرداروں کے اعمال اور نتائج اعمال حقیقی اور واقعی ہوتے ہیں۔ پلاٹ کے مختلف جوڑ باہم ایسے پیوستہ ہوتے ہیں جیسے کسی بہترین مصوّر کی تصویر

البتہ اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو افسانوں میں پلاٹ کے اجزا میں حسنِ تناسب نہیں۔ مثلاً "سرِ دلبراں" میں فیاض کی کہانی جس طریق پر اصل افسانے میں داخل کی گئی ہے۔ اس میں تکلّف اور تصنّع معلوم ہوتا ہے۔ عاشق صاحب نے راہگذر میں بعض اہم ادبی مسائل پر بھی بحث کی ہے۔ ناظرین شاید اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ آج کل ایک چیز "نیا ادب" کے نام سے ملک میں رائج ہوئی ہے جس کے بعض پہلو تو بلاشبہ بہت مستحسن ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس کے پردے میں بعض "جاہل ادیب" ہماری زبان کو بگاڑنے میں مصروف ہیں۔ ان "جہلا" کا یہ خیال ہے کہ زبان اور محاورہ ادب کے لئے ضروری نہیں۔ صرف خیالات کی ضرورت ہے جن کے لئے جیسا کچھ لباس میسر آئے۔ پہنا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "ہر بندی محاورے کی خلاف ورزی اور اصول زبان سے انحراف کو ادبی اجتہاد کے نام سے پکارتا ہے"۔ یہ ادبی مجتہد آج کل "ترقی پسند ادیب" کے خوبصورت لقب سے ملقب ہو کر میدان میں آرہے ہیں اور ترقی پسندی کی پسندیدہ تحریک کی جڑ پر کلہاڑا مار رہے ہیں۔ عاشق صاحب نے "خوشبو دار خط" میں اشفاق کی زبان سے اس معاملے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ "جاہل ادیبوں" کے لئے بہت حد تک باعث عبرت ہیں۔

"لیکن زبان کے وہ محاورے اور ادب و انشا کے وہ قواعد جو ہمارے ان بزرگوں

کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن کا وجود آج بھی ہمارے ادب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے کیونکر نظر انداز کئے جا سکتے ہیں۔ مرکزیت کے مٹ جانے سے یہ مراد نہیں کہ اب زبان کے مروجہ و مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہر بغاوت کو اصلاح پسندی اور روشن خیالی سے تعبیر کیا جائے۔ اگر یہ رَوِش چل نکلی تو نااہل لوگ اپنی بے مائگی کو چھپانے کے لئے زبان پر ہر قسم کے ظلم روا رکھیں گے"۔

اسی سلسلے میں اشفاق کی یہ رائے کتنی صائب ہے:۔

"میں یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ زبان کے مسئلے کو پس پشت ڈال دیا جائے نظم ہو یا نثر صحتِ زبان ہر صورت مقدم ہے اور جو شخص زبان پر پوری قدرت نہیں رکھتا وہ نہ اچھا شاعر بن سکتا ہے نہ اچھا ادیب"۔

یہی وجہ ہے کہ عاشق صاحب نے اپنی تحریروں میں الفاظ کے حسن انتخاب پر بہت زور دیا ہے۔ وہ خوبصورت اور لطیف ترکیبوں کے دلدادہ ہیں لیکن اس کے باوصف سلاستِ زبان اور روانی میں مطلق فرق نہیں آتا بلکہ یوں کہا جائے کہ بعض جگہ تو سہل ممتنع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے عاشق صاحب کو ایک شاعر کا دل و دماغ عطا کیا تھا۔ اُن کی نثر بھی شعر کی طرح رنگینی اور دلکشی و دلآویزی کا مجموعہ ہے۔ الفاظ کیا ہیں قند و نبات جن کے بار بار ادا ہونے سے ذائقہ مسلسل شیرینی سے لذت اندوز ہوتا رہتا ہے۔ "حورِ صحرا کے نام" جو پیغام بھیجا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:۔

"پھر سوچتا ہوں کہ یہ شعر و ادب ہے کیا؟ بس اُس کی ایک جھلک کے بھڑکائے ہوئے

شعلوں کی تپش، اُس کی ایک نظر سے برپا کئے ہوئے طوفانوں کی لہر اور اُس کی ایک آواز کے متحرک کئے ہوئے نغموں کا ترنّم! شعلوں کی اس تپش، طوفانوں کی اس لہر اور نغموں کے اس ترنّم نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا ہے لیکن میرے دل و دماغ کی دنیا اسی تپش اسی لہر اور اسی ترنّم سے آباد ہے۔ یہ چیزیں مجھ سے چھین لو اور میں اس بے آب و رنگ دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش سے دست بردار ہو جاؤں گا۔"

"کاشانۂ محبوب کو دیکھ کر، دل میں جو طوفانِ جذبات اُبھرا، اُس کا اظہار یوں ہوتا ہے:۔

"تم بمشکل یہاں دو مہینے ٹھہریں۔ ہمارے درمیان بہت کم باتیں ہوئیں لیکن وہ فصاحت جو صرف آنکھوں کے حصّے میں آئی ہے، ہمیشہ محوِ تکلم رہی۔ تم نے سب کچھ کہہ دیا جو تمہیں کہنا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ گہرے پانی کی سطح ہمیشہ ساکن ہوتی ہے۔ اب تم مجھ سے سینکڑوں کوس دور ہو اور زمانے کی رفتار کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہم شاید کبھی یکجا نہ ہو سکیں گے۔ خانۂ دل جو تمہارے ہاتھوں بن بن کر بگڑا، اب صرف ان آرزوؤں سے آباد ہے جو حسرتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ کیا یہ کبھی نہ ہوگا کہ تمہارے دیارِ حُسن سے آنے والی ہوائیں تمہاری آواز کا ترنّم، تمہاری باتوں کا رس، تمہاری دلبری کی ادائیں، تمہاری آنکھوں کی شوخیاں، تمہارے ہونٹوں کی رنگینیاں، تمہارے لباس کی خوشبوئیں اور تمہارے بالوں کا عنبر اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اس طرف لے آئیں اور یہ جانِ حزیں گھڑی بھر کے لئے تم سے ہم کنار ہو جائے۔"

"قدرت کی گود میں" لارنس کی شام کا منظر، جہلم یہل میں نعیم کی خود فراموشی کی

تصویر، آصف کی عیاشی، آصف اور عشوہ فروش کی پہلی ملاقات، فردوس کے آغاز شباب کی بے نام تمنائیں نعیم کا قدرت کی گود میں تسلی پانا، آصف کے مجرم ضمیر کی سیاہی اور اس نوع کے بہت سے حصے کتاب میں ایسے ہیں جو ہمارے مصنف کے کمالِ صنعت کا زندہ ثبوت ہیں۔

کہتے ہیں۔ آرٹ مقصد سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اگر اس فرسودہ خیال کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی ہم آرٹسٹ کو آرٹ سے الگ نہیں کر سکتے جو ایک خاص ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ جہاں اس کے فکر اور احساسِ جمال کی تربیت ہوتی ہے۔ بنابریں یہ سوال کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ راہگذر کے مصنف اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؛ کامیابی بلحاظ آرٹ نہیں بلکہ وہ کامیابی جس کا تعلق ہماری زندگی کے لاینحل مسائل کا حل تلاش کرنے سے ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ خود مصنّف کو میرے ساتھ کہاں تک اتفاق ہوگا لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت مصنف ہماری سوسائٹی کے اختلال پذیر نظام کی بعض مشکلات کا حل پیش کرنے میں تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہیں۔ جب ہمارے نظام معاشرت میں مسائلِ علمہ کے متعلق آزادی سے گفتگو کرنے کی عام اجازت ہو جائے گی تو بہت ممکن ہے کہ ہمارے مصلحین اپنے اس تذبذب اور ابہام کو دور کر سکیں۔ "روشنی کی کرن" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگر اتفاقات جدائی اور فراق کی صعوبتوں سے دو چار کر دیں، تو سعید اور زبیدہ کی طرح ضبط سے عمر بسر کر دینی چاہیے۔ "قدرت کی گود میں" جو جھوٹی تسلی نعیم کو دی جا رہی ہے۔ وہ غیر حقیقی ہے۔ "جوانی کا خواب"، اسی تذبذب

اور ابہام کا نمونہ ہے۔ "ستر دلبراں" اور "زندگی کی صبح" میں محض قربانی ہے جو ملکوتی صفات انسان ہی کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ البتہ "فریب خیال" میں تقین اور پختہ رائے کا اظہار ہے۔ اور یہ افسانہ ایک معیّن نقش اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

بایں ہمہ راہگذر میں سب سے زیادہ موثر سبق سوسائٹی کے لئے ضبط، اعتدال، اور نظم کا ہے جو سوسائٹی کے بقا کے لئے افراد کے فرائض میں سے ہے اگر راہگذر کے ہر افسانے کے مرکزی خیال پر غور کیا جائے تو شاید ہم اسی نکتۂ لطیف سے روشناس ہوں گے کہ سوسائٹی اپنے قوام و استحکام کے لئے نظم اور باقاعدگی کی محتاج ہے اور افراد اگر مطمئن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں بے مقصد بغاوت سے احتراز کرنا چاہئے۔

اس وقت ہمارا افسانہ جس روش پر چل رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر افسانے کی ترقی کے متعلق ایک عام مایوسی پیدا ہو چلی تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند افسانے اب کیا بلحاظ مضمون و معنی اور کیا بلحاظ زبان، بہت پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے روسی ادب کے مفید اثرات سے کوئی فایدہ حاصل نہیں کیا۔ بلکہ اندھی تقلید کی وجہ سے ہم اپنی مقامی خوبیوں کو بھی فراموش کر رہے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہم یا محض ترجے پر اکتفا کرتے یا ان کے اصول کو مقامی ضرورتوں کے ساتھ پیوند دیکے آرٹ کے عمدہ نمونے منصۂ شہود پر لاتے۔ ان حالات میں عاشق صاحب کے موجودہ افسانے ہم کو ایک بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ ان میں زبان اور محاورے کی

خوبی کے علاوہ معنی اور موضوع کی متانت بھی موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مصنّف نے ملک کے سب سے بڑے سیاسی مسئلہ یعنی آزادی کی جدوجہد کی طرف بہت کم توجّہ کی ہے لیکن ان افسانوں کا عام رجحان ملکی فضا اور اُس کی ضرورتوں کے ساتھ بہت حد تک ہم آہنگی رکھتا ہے۔ توقع ہے کہ صنّاعی اور حُسنِ تخلیق کے اعتبار سے یہ مجموعہ ہمارے ادب میں نمایاں امتیاز حاصل کرے گا۔ اور زبان و محاورے کے معاملے میں نوجوان ادیبوں کے لئے مشعلِ راہ بنے گا۔

روشنی کی کرن

روشنی کی کرن

سعید شام کے وقت شملہ کی مال پر کھڑا حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کشمیر سے لے کر مدراس تک کا تموّل اور حُسن اپنی پوری شانِ خود آرائی کے ساتھ سامنے سڑک پر متحرک تھا۔ بنے ٹھنے، بانکی وضع کے نوجوان اور خوبصورت، جامہ زیب عورتیں خراماں خراماں چلی جا رہی تھیں۔ ہوا میں قہقہوں کا لوچ اور خوشبو کی مہک رچی ہوئی تھی۔ انگریزی طرز کی دُکانیں، جن میں ہزاروں لاکھوں کا ولائتی مال بھرا پڑا تھا، اس سلیقے سے سجائی گئی تھیں کہ راستہ چلنے والوں کی توجہ خواہ مخواہ اُن کی طرف مبذول ہو جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا اور بجلی کی روشنی نے اس رونق کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔

سعید سوچ رہا تھا کہ شملہ کا یہ منظر دیکھ لینے کے بعد کوئی شخص کیونکر باور کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ فاقہ کشی کی

زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں باشندے تن ڈھانکنے کو چند گز کپڑے اور پیٹ بھرنے کو روٹی کے چند ٹکڑوں سے محروم ہیں۔ اور اس خطۂ ارض پر بسنے والے بے شمار انسان محض افلاس کے ہاتھوں قبل از وقت موت کی نذر ہو رہے ہیں۔ سعید نے سوچا کہ اگر یکایک کسی طلسمی طاقت سے مال کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی اُن درماندہ، مفلوک الحال اور خستہ و نیم جان بستیوں کا نقشہ بھی سامنے آجائے تو یہ عشرت پسند اور نازک مزاج لوگ جو سات ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے کے باوجود بے چین راتیں بسر کرتے ہیں۔ اُن آبادیوں کو دیکھ کر کیا کہیں گے۔ جہاں عورتیں پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں جسم چھپائے، تپتی ہوئی دوپہر میں پتھر اٹھا اٹھا کر مزدوری کرتی ہیں اور ننھے شیر خوار بچے پاس زمین پر پڑے دودھ کے لئے بلبلاتے ہیں۔ جہاں قحط زدہ، فاقہ کش اور مجبور و لاچار مزدوروں کی برہنہ پشت پر اس لئے کوڑے برستے ہیں کہ انہوں نے کسی جاگیردار کے کارندے سے کام کی اُجرت طلب کی تھی۔

سعید نے دیکھا کہ چند عورتیں حریر و دیبا میں ملبوس، چہروں کو غازہ و گلگونہ سے رشکِ آفتاب بنائے اور بالوں کو حد درجہ احتیاط سے سنوارے آرہی ہیں۔ اِن عورتوں کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہونے لگا۔ بیش قیمت اور مرصع ساڑھیاں اُن کے جسموں پر عشق پیچاں کی بیل کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔ خوشبوؤں میں بسے

ہوئے بال گھنٹوں کی محنت سے آراستہ کیئے گئے تھے اور قدم قدم پر اُن کے جسموں کی لچک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ حُسن و نزاکت کے مجسّمے ابھی ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ خود اعتمادی کے رنگ میں مسکراتی، دُزدیدہ نگاہوں سے گرد و پیش کی ہر چیز کا جائزہ لیتی اور اپنے پیچھے ہوا میں عطر کی خوشبو کی ایک لہر پیدا کرتی یہ نور و لطافت کے خمیر سے بنی ہوئی پُتلیاں انگریزی دُکانوں میں بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہی تھیں داخل ہونا شروع ہوئیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ شب و روز کی محنت سے پیدا کی ہوئی دولت سے جس میں ہزاروں غریبوں کے خون کی آمیزش تھی، آرائش اور سنگار کا سامان خریدا جا رہا تھا۔

سعید نے سوچا کہ اگر ان چہروں سے غازے کی آب و تاب، آنکھوں سے سُرمے کا دُنبالہ، ہونٹوں سے سُرخی کی جلا اور ابروؤں سے کاجل کی شوخی چھین لی جائے تو کیا یہ چہرے اتنے ہی حسین، یہ آنکھیں اتنی ہی فتنہ ساماں، یہ ہونٹ اتنے ہی دلکش اور یہ ابرو اتنے ہی قاتل رہیں گے۔ اگر یہ دُبلے پتلے جسم جو شاخِ گُل کی طرح ہوا کے ہر جھونکے سے لچک لچک جاتے ہیں، ان زرنگار ساڑھیوں سے محروم ہو جائیں تو کیا یہ قد اتنے ہی رعنا، یہ رفتار اتنی ہی حشر انگیز اور یہ انداز اتنے ہی ہوش رُبا ہوں گے۔

بے اختیار اُس کی نظریں اپنے آپ پر پڑ گئیں۔ وہ موٹے کھدّر کا پاجامہ اور کُرتہ پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں معمولی سا چپّل اور سر پہ کھدّر کی کشتی نما ٹوپی تھی

وہ ابھی تین مہینے ہوئے دو سال کی قید کاٹ کر جیل سے رہا ہوا تھا۔ ترکِ موالات کی سیاسی تحریک میں اُس نے بہت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ قانون کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اُس نے وکالت کے پیشے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ترکِ موالات کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور عدالتوں کے مقاطعہ کی تلقین ہونے لگی۔ سعید خود آتشیں جذبات کا مالک نوجوان تھا۔ چنانچہ مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وہ بے دریغ سیاست کے خارزار میں کود پڑا۔ وہ اس رَو میں بہتا چلا گیا۔ تقریر و تحریر پر اُسے قابلِ تحسین عبور تھا لیکن نو عمری کی وجہ سے وہ احتیاط اور دور اندیشی نہ تھی جو صرف پختہ سالی سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنی انقلاب انگیز اور خلاف آئین تقریروں کی بنا پر وہ جلد ہی گرفتار ہو کر سزایاب ہو گیا۔

طالب علمی کے زمانے میں بھی سعید اپنی اُفتادِ مزاج کے اعتبار سے دلچسپ اور متضاد عناصر کا مجموعہ تھا۔ قومی جوش تو ہر وقت اُس کے اندر موجزن رہتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ شاعرانہ دل و دماغ کا مالک اور ایک حقیقی صنّاع کی کی طرح خوبصورت چیزیں وضع کرنے اور اُن سے حظ اٹھانے کا شوقین بھی تھا انہی دنوں میں اُس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جو اُس کے بہت دُور کے قرابت داروں میں سے تھی۔ اُس کا نام زبیدہ تھا۔ زبیدہ بی اے میں پڑھتی تھی اور اُس کے باپ نے جو سرکاری ملازمت کی وجہ سے تقریباً تمام عمر گھر سے باہر رہا تھا اب پنشن لینے کے بعد وطن میں بود و باش اختیار کر لی تھی

زبیدہ کی شکل وصورت میں دلکشی اور عادات واطوار میں شائستگی اور متانت تھی۔ اُس کے چہرے سے ذہانت اور ہمدردی کے آثار ٹپکتے تھے۔ سعید جب پہلی مرتبہ اُس سے ملا تو اپنے دل پر عجیب وغریب تاثرات لے کر آیا۔ زبیدہ کی مہذب گفتگو، نشست وبرخاست میں اُس کا قابلِ رشک سلیقہ، ذکاوت وذہانت کے ساتھ اُس کی ادبی لیاقت اور قومی وملکی معاملات سے اُس کی گہری دلچسپی۔ اِن تمام باتوں نے مل کر سعید کے دل میں زبیدہ کے لئے بہت بڑی جگہ بنا دی پھر آہستہ آہستہ اُنہیں ملاقات کے زیادہ موقعے میسّر آنے لگے۔ تعلیمی مشاغل میں منہمک ہونے کی وجہ سے اُن کی باتیں بالعموم علمی وادبی موضوعات تک محدود رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ہند اور بیرونِ ہند کے سیاسی حالات بھی زیرِ بحث آجاتے تھے۔

سعید نے حیرت انگیز مسرت کے ساتھ دیکھا کہ زبیدہ قومی ادبار کو شدّت سے محسوس کر رہی ہے۔ وہ اکثر اُن اسباب و واقعات پر اظہارِ خیال کرتی جو اُس کے نزدیک ہندوستان کی موجودہ پستی کا باعث تھے اور پھر اس زبوں حالی سے نجات پانے کے لئے اپنی فہم وفراست کے مطابق تدابیر بھی پیش کیا کرتی۔ سعید کے دل میں ملک وملّت کے درد کی جو چنگاری چھپی ہوئی تھی، وہ اِن گفتگوؤں کے بعد پہلے سے زیادہ روشن ہو جاتی تھی۔ سعید گھر آکر سوچتا کہ زبیدہ کی معیّت اُس کے لئے کس درجہ خیال انگیز، روح پرور اور حیات افروز ہے۔ وہ جب بھی

اُس سے مل کر آتا اپنے دماغ میں زندگی کا نیا تصوّر دل میں جدوجہد کا نیا ولولہ اور روح میں عزم و ہمت کا نیا جذبہ محسوس کرتا تھا۔ اِس کے علاوہ زبیدہ کے مزاج کا جمالیاتی پہلو بھی اُس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ ادب کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتی تھی اور موسیقی میں اُسے کافی دسترس تھی۔ شعر و سخن کی گفتگو میں سعید بسا اوقات اُس کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ زبیدہ کی جامہ زیبی اور اُس کے لباس کی نئی سے نئی وضع قطع، جس کے اختراع میں خود اُس کی فن کارانہ طبیعت کو بہت دخل تھا، سعید کے لئے کسی بلند پایہ صنّاع کے شاہکار سے کم اہمیّت نہ رکھتی تھی۔ زبیدہ کی ہر چیز اُس سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ زبیدہ کے سامنے اُس کی کسی چیز کی تعریف نہ کرے۔ وہ اُس کے مُنہ پر مدح و ستائش کے کلمات کہنا مذاقِ سلیم کے منافی سمجھتا تھا۔ یوں بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ زبیدہ پر ظاہر ہو کہ وہ اُس سے کس حد تک متاثر ہو چکا ہے۔ تنہائی میں اِس ضبط و احتیاط اور بیگانگی و بے نیازی کا زبردست ردِّ عمل شروع ہوتا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے، مطالعہ کی میز پر جُھکے جُھکے اور بستر پر لیٹے لیٹے اُس کی چشمِ تصوّر کے سامنے زبیدہ آ جاتی۔ زبیدہ کی صورت ایسی نہ تھی کہ نظرِ اوّل میں دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں لیکن قدرت نے اُس کے حُسن میں ایسی ملائمت اور دلکشی رکھی تھی کہ انسان جُوں جُوں اُسے دیکھتا فریفتگی اور والہیّت کا جذبہ بڑھتا جاتا تھا۔ سعید کے سینے میں جذبات کی نئی نئی لہریں

اُٹھ رہی تھیں اور اُس کی دنیا خیالات کی نئی سے نئی دلآویزیوں سے مزین ہو رہی تھی۔

مدت ہوئی زبیدہ کی منگنی ایک بہت امیر گھرانے میں ہو چکی تھی۔ لڑکا فارغ التحصیل ہو کر اب ایک اچھے عہدے پر فائز تھا اور اُن کا تقاضا تھا کہ شادی جلد ہو جائے زبیدہ کے والدین اس انتظار میں تھے کہ زبیدہ تعلیم سے فارغ ہو تو یہ فرض بھی ادا کر دیا جائے زبیدہ نے اس رشتے پر کبھی اظہارِ خیال نہ کیا تھا اور اُس کی عزیز ترین سہیلیوں میں سے بھی کسی کو اُس کی خوشی یا ناخوشی کا حال معلوم نہ تھا۔ خود زبیدہ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق اتنا جانتی تھی کہ وہ ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ ہے، تعلیم یافتہ ہے اور سرکاری ملازم ہے۔ اُس کے مذاق اور مزاج کے متعلق اُسے صرف اتنی واقفیت تھی کہ وہ دفتری زندگی کے علاوہ اور کسی چیز سے شغف نہیں رکھتا۔ قومی و ملکی معاملات سے اُسے کچھ دلچسپی نہیں۔ شعر و ادب کی طرف اُس کا بالکل رجحان نہیں اور اُس کی سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ کبھی کبھی دوستوں میں بیٹھ کر تاش کھیل لیا جائے۔

سعید سے ملنے کے بعد زبیدہ کو عمر میں پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ ایک ہم خیال و ہم ذوق نوجوان مرد کی رفاقت کس درجہ خوشگوار اور روحانی مسرت سے لبریز ہوتی ہے۔ زندگی کے متعلق جب دونوں کے نظریے ہم آہنگ ہو جائیں۔ یا اگر اختلاف ہو بھی تو اتنا جتنا موسیقی کے دو سُروں میں ہوتا ہے تو دل و دماغ کی شگفتگی کے

لئے یہ صحبت کتنی مؤثر و مفید ہوتی ہے۔ خیال اور مذاق کی یگانگت سے ہمدردی اور ہمدردی سے محبت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ زبیدہ نے بکایک محسوس کیا کہ اُس کے دل کے ایک خفیہ گوشے میں سعید کے لئے بہت لطیف اور نرم و نازک جذبات پرورش پا رہے ہیں۔ یہ احساس جس ناگہاں تیزی سے رونما ہوا اُسی قوت کے ساتھ زبیدہ نے اُسے دبا دینے کی کوشش کی۔ ایک کنواری لڑکی کے لئے، جس کی منگنی ہو چکی ہو، کیسے زیبا ہے کہ ایک اور نوجوان کے خیال کو اپنے دل میں جگہ دے۔ زبیدہ نے سعید سے میل ملاقات ترک کر دی کہ مبادا یہ چنگاری کہیں بھڑک کر شعلہ بن جائے۔ سعید اب بھی گاہے گاہے اُن کے ہاں جاتا، لیکن زبیدہ کی طرف سے کسی سرگرمی کا اظہار نہ پا کر وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ واپس آجاتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ عورتوں کی تلون کیشی کے قصے جو اُس نے کتابوں میں پڑھے تھے من و عن درست نکلے۔ زبیدہ کی سرد مہری کو اُس نے نسوانی فطرت کی اس روایتی دھوپ چھاؤں پر محمول کیا جہاں عورت گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہے۔

زبیدہ نے جب بی اے کر لیا تو اُس کی شادی ہو گئی۔ سعید کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے شادی سے چند روز پہلے کہیں باہر چلا گیا تاکہ اس تقریب میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن اُس کا تحفہ زبیدہ کے جہیز میں موجود تھا۔ یہ ایک عورت کا خوبصورت مجسمہ تھا جو سنگِ مرمر سے تراشا گیا تھا۔ عورت کے ہاتھ میں سورج مکھی کا پھول تھا جس پر آفتاب کی شعاعیں پڑ رہی تھیں اور خود عورت کا وجود سراسر تاریکی میں

تھا۔

زبیدہ معصومیّتِ کردار اور پاکیزگیٔ خیال کی تمام رعنائیاں لے کر اپنے خاوند کے پاس گئی اور ہمیشہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ اُس کے دل کے ہر کونے میں خاوند کی محبت جاگزیں ہے۔ سعید کے متعلق اُسے براہِ راست کوئی اطلاع موصول نہ ہوتی تھی کبھی کبھار وہ میکے جاتی بھی تو سعید سے ملاقات نہ ہونے پاتی تھی۔ اُس نے سنا کہ سعید کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ پھر پیہم اُس کو سعید کی بیماری کی خبریں پہنچنے لگیں۔ اس دوران میں سعید قانون کی تعلیم ختم کر چکا تھا لیکن آئندہ بسرِ اوقات کے متعلق اُس نے کوئی طریق کار تجویز نہیں کیا تھا۔ اُس کے دوست احباب اور عزیز واقربا زور دے رہے تھے کہ وہ جلد وکالت شروع کر دے لیکن خود اُس کی حالت یہ تھی وہ ناقابلِ فہم طریق پر اداس، غمگین اور پریشان نظر آتا تھا۔ پوچھنے پر بھی وہ اپنے دل کا حال کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس پُراسرار تبدیلی کی وجوہ بیان کرتے وقت وہ صرف اپنی ناسازیٔ مزاج کا ذکر کر دیتا تھا۔ اُس کے فکر مند والدین نے اس خیال سے کہ شاید تبدیل آب وہوا سے کچھ فائدہ ہو اُسے دو ایک ماہ کے لئے باہر بھیج دیا لیکن جب وہ واپس آیا تو اُس کی خود ساختہ بیماری ویسی ہی شدید اور ناقابلِ علاج تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ سعید کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہے۔

زبیدہ جب میکے آئی اور سعید کے متعلق اُس نے تشویش ناک باتیں

سنیں تو خود اُسے دیکھنے کے لئے ایک دن اُس کے مکان پر چلی گئی۔ سعید نے پہلے تو چاہا کہ ملنے سے انکار کر دے لیکن چونکہ وہ مکان میں تنہا تھا اس لئے ملاقات کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ زبیدہ نے ڈرتے ڈرتے، محجوبانہ انداز میں مزاج پُرسی کی تو سعید نے رسمی طور پر شکریہ ادا کیا اور پھر یکایک، دیکھتے ہی دیکھتے، اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب بہ نکلا۔ زبیدہ نے حیران ہو کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن سعید کی یہ حالت تھی کہ کمسن بچے کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ صبر و ضبط کی وہ دیوار جس نے اب تک اُس کی آنکھوں کو خون چکانی سے روک رکھا تھا مسمار ہو چکی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اِن آنسوؤں کی روانی میں اُس کے خونِ جگر کا آخری قطرہ بھی بہ جائے تو اچھا ہے۔ وہ آگ جو مدت سے اُس کے رگ و ریشہ میں سُلگ سُلگ کر اُسے نیم جان بنا رہی تھی اب ہوا کے ایک جھونکے سے شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اِن شعلوں میں جل کر یکبارگی خاک سیاہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ زبیدہ تھر تھر کانپ رہی تھی کہ اگر اس حالت میں کوئی آگیا تو کیا ہوگا۔ وہ ایک لمحہ میں سعید کے دل کا راز پا چکی تھی۔ اُس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ سعید اپنے آپ کو اُس کی خاطر یوں تباہ کر رہا ہے۔ اب جو اُس نے دیکھا کہ وہ اپنی جوانی کے ایامِ بہار کو اس کی یاد میں سوگوار بنا رہا ہے تو اُس کے لطف و رحم کا فطری جذبہ فوراً بیدار ہو گیا اور ساتھ ہی اُن جذباتِ شوق میں حرکت پیدا ہوئی جو سعید کے متعلق مدت سے زبیدہ کے دل میں موجود تھے اور

جنہیں وہ ہزار مصلحت اور کوشش سے دبا دبا کر اپنے خیال میں مٹا چکی تھی۔ وہ شرم و حجاب کی بندشوں اور آداب و وضع کی پابندیوں کے حصار سے دفعتاً چند منٹ کے لئے باہر نکل آئی۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے سعید کے آنسو پونچھے۔ الفاظ اس کے حلق سے نکلتے نہیں تھے لیکن اُس نے اپنے آپ پر جبر کیا اور ٹھہر ٹھہر کر لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگی ”خدا کے لئے طبیعت کو سنبھالو۔ مقدر کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب یوں رو رو کر اپنے آپ کو ہلاک کرنے سے کیا فائدہ تم اپنا خیال نہیں کرتے تو میری ہی عزت کی پروا کرو۔ ذرا سوچو، اگر یہ راز عام ہو جائے تو میرا کیا حشر ہوگا۔ مجھے زمین و آسمان کے درمیان سر چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی یاد رکھو میری آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکل گیا تو میں عمر بھر کے لئے تباہ ہو جاؤں گی۔“

ان آخری الفاظ نے سعید پر معجز نما اثر کیا۔ اُس کے بہتے ہوئے آنسو فوراً خشک ہو گئے اور اُس کے چہرے پر خشونت آمیز متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے انتہائی لجاجت کے ساتھ، گویا بھکاری کسی امیر آدمی سے خیرات طلب کر رہا ہے، کہا ”میں تم سے ادنے التفات کی بھیک مانگتا ہوں اور اس کے عوض وعدہ کرتا ہوں کہ میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔ اگر تمہیں میرے خلاف کبھی کوئی وجہ شکایت ہوئی بھی تو میں اپنا گلا کاٹ لوں گا۔“

زبیدہ نے اُس کو یقین دلایا کہ دل میں جب ایک مرتبہ شوق کی آگ بھڑکتی

ہے تو بجھتی کبھی نہیں چنگاریاں راکھ کے اندر دبی رہتی ہیں اور دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ تنور ٹھنڈا ہو گیا۔ سمندر بظاہر پرسکون نظر آتا ہے لیکن سطح کے نیچے شورش و اضطراب کا ایک محشر بپا ہوتا ہے۔ آؤ ہم اس وقت عہد کریں کہ شوق کے ان دھاروں کو خاموشی سے بہنے دیں گے۔ ان میں طوفان کا آنا اچھا نہیں۔ اس دنیا میں تو ہم آپس میں نہ مل سکیں گے لیکن ایک زندگی اور بھی ہے جہاں اس دنیا کے رسم و رواج کی حکومت نہیں۔"

زبیدہ کے پے در پے اصرار سے مجبور ہو کر سعید نے شادی کر لی۔ زبیدہ سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد سعید کے خیالات کا انتشار رفع ہو جائے گا۔ اور اُس کی زندگی ایک نظام کے ماتحت کام کرنے سے باقاعدگی اختیار کر لے گی سعید مسلسل انکار کئے جاتا تھا لیکن زبیدہ اُسے بار بار دھمکی دیتی تھی کہ اگر اُس نے اُس کی بات نہ مانی تو وہ ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جائے گی۔ سعید کا خیال تھا کہ زبیدہ کی محبت کو دل میں جگہ دینے کے بعد کسی عورت سے شادی کرنا بے وفائی کی مکروہ ترین صورت تھی۔ وہ اُس کی یاد میں زندگی بسر کرنے کا تہیّہ کر چکا تھا۔ آخر جب وہ زبیدہ کے روز روز کے تقاضوں سے تنگ آ گیا تو اُس نے حامی بھر لی۔

زبیدہ کے مشورے اور کوشش سے ایک بڑے اونچے گھرانے میں رشتہ ڈھونڈا گیا۔ سعید کی بیوی تعلیم یافتہ، حسین اور مہذب و شائستہ تھی لیکن متموّل اور بہت حد تک مغربی معاشرت رکھنے والے کنبے میں پرورش پانے کی وجہ سے اُس کے

مزاج میں نخوت اور خود پسندی کا عنصر غالب تھا۔ زبیدہ کو یقین تھا کہ خانگی زندگی کی دلچسپیاں آہستہ آہستہ سعید کے درد کا درماں بن جائیں گی۔ سعید بھی ایک ذمہ دار شوہر کی طرح اپنی بیوی کے آرام و راحت کا ہر گھڑی احساس رکھتا تھا چنانچہ شروع شروع میں اُمید بندھ چلی تھی کہ دونوں میاں بیوی باہمی کوششوں سے اپنے لئے ایک روشن و زرّیں مستقبل وضع کرلیں گے۔ سعید نے اگرچہ کبھی اِس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن وہ غیر شعوری طور پر متوقع تھا کہ اُس کی بیوی اُس کے دُکھے ہوئے دل کے لئے مرہم مہیّا کرے گی۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے ماضی کی داستان سے آگاہ کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس بات کا آرزو مند تھا کہ وہ اُس کی لوحِ قلب سے غمِ رفتہ کے اندوہگیں نقوش کو مٹانے کے لئے درد و محبت کے چند آنسو بہائے۔ وہ اُس سے دلجوئی، غم خواری اور شفقت و اُلفت کی اُمید لگائے بیٹھا تھا لیکن اُسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اُس کے اور اُس کی بیوی کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ جس قدر خیال پرست اور جذبات پرور انسان تھا اُس کی بیوی اسی قدر خود نمائی اور خود پسندی کے دائرے میں محصور تھی۔ سعید کو علمی و ادبی کاموں سے دلچسپی تھی۔ وہ قومی معاملات اور سیاسی تحریکات سے بھی شغف رکھتا تھا۔ لیکن اُس کی بیوی کو اِن باتوں سے کوئی دلبستگی نہ تھی۔ وہ عام لوگوں کے مذاق کی ہم نوائی کرنا یا اُن کی سطح پر رہ کر زندگی گزارنا اپنے خاندانی وقار کے خلاف سمجھتی تھی۔ جس ماحول میں اُس نے تربیت پائی تھی اُس کا تقاضا تھا کہ وہ ایک بلند پایہ، صاحبِ ثروت، جاہ پسند خاتون کی طرح

ایک حکیمانہ انداز اور شانِ خود آرائی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ سعید کا حسّاس دل غربت و افلاس اور مصیبت و ناداری کے تکلیف دہ مناظر دیکھ کر تڑپ اُٹھتا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش، ملک کے اندر، جہالت، غلامی، تنگدستی کی خوفناک تصویریں دیکھتا تو اُس کی روح کانپ کانپ جاتی تھی لیکن اُس کی بیوی اِن چیزوں سے بالکل اثر پذیر نہ ہوتی تھی۔ وہ سعید کی خیال آرائیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی وہ ہمیشہ اُس کو تنبیہہ کرتی تھی کہ اِن بے سود اور مضر خیالات کو ترک کر دے۔ سعید حیران تھا کہ جو عقائد اُس کی زندگی کا جزو بن چکے تھے اور جو رُجحانات بڑھتے بڑھتے اُس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئے تھے اُن کو ترک کرنے کے بعد اُس کے پاس رہ کیا جائے گا۔ زاویہ ہائے نگاہ کے اس اختلاف نے دونوں میں غلط فہمی پیدا کر دی اور اس غلط فہمی کو سعید کی بیوی کی متکبرانہ روش نے بڑھا بڑھا کر کشیدگی کی حد تک پہنچا دیا۔ سعید جو پہلے ہی دل گرفتہ و پریشان تھا اور زیادہ غمگین رہنے لگا۔

اتنے میں ترکِ موالات کی ہنگامہ خیز تحریک شروع ہو گئی۔ ہندوستان کی سیاسی فضا میں شعلے بلند ہونے لگے اور ملک کے طول و عرض میں انقلاب کی ایک ایسی زبردست رو چلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کہرام مچ گیا۔ کالج اور اسکول بند ہو گئے۔ وکلا عدالتوں کو خیرباد کہہ کر میدانِ عمل میں نکل آئے اور قید و بند کا سلسلہ شدت کے ساتھ جاری ہو گیا۔ سعید سوچ رہا تھا کہ تحریک میں شرکت کرنے

اور گوشۂ عافیت میں پناہ لینے میں سے کس کو ترجیح دے۔ ملک و ملت کے جس درد سے وہ ہمیشہ بے تاب رہا تھا۔ اُس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وقت کی آواز پر بلا تامّل لبیک کہا جائے لیکن اُس کی بیوی سدِّ راہ ہو رہی تھی۔ سعید کچھ دیر اس کشمکش میں مبتلا رہا اور آخر قوم کی پکار کے سامنے اُس نے اپنی بیوی کی رائے کو ٹھکرا دیا۔ وکالت چھوڑ کر وہ قومی رضاکاروں کی جماعت میں شامل ہو گیا اور اُس کی بیوی ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی۔ سعید نے اِس مستعدی اور سرگرمی سے کام کیا۔ گویا اُس کی زندگی کا تنہا مقصد یہی تھا اُس نے اپنے صوبے کے دُور دراز گوشوں میں جا جا کر عوام کو آزادی کا پیغام سنایا۔ تقریر و تحریر کے ذریعے سے اُس نے جگہ جگہ قانون شکنی کے جراثیم پھیلا کر لوگوں کو حکومت کے خلاف صف آرا ہونے پر اُبھارا۔ انجام کار اُس کی سرگرمیوں کو خلافِ آئین قرار دے کر حکومت نے اُس پر بغاوت پھیلانے کا مقدمہ قائم کیا اور دو سال قید با مشقت کی سزا دے دی۔

جب وہ قید کی میعاد ختم کر کے جیل سے نکلا تو ملک کی حالت یکسر بدل چکی تھی۔ ترکِ موالات کی تحریک فرقہ وارانہ کشیدگی کے ہاتھوں سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی۔ روشن خیال اور مخلص قومی کارکن کوئی واضح اور معیّن لائحہ عمل پیشِ نظر نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ سیاسیات سے کنارہ کش ہوتے جا رہے تھے۔ سعید اس افسوسناک ردِّ عمل سے بے حد متاثر ہوا۔ اُس کی جسمانی صحت اور مالی حالت سخت نازک ہو گئی تھی۔ آئندہ کی فکر نے اُس کے مستقبل کو اور بھی تاریک بنا رکھا تھا۔ اِن حالات میں اُس کو

ہمدردی اور دل نوازی کی جائز توقع اگر کہیں سے ہو سکتی تھی تو اپنی بیوی سے لیکن وہ سعید سے اِس قدر ناراض تھی کہ اُس نے دو سال کے عرصے میں اُس سے ملنا یا اُس کو خط تک لکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ وہ سعید کے قید ہو جانے کو اپنی خاندانی عظمت و نجابت کے دامن پر ایک ایسا مکروہ دھبہ سمجھتی تھی جس کے لئے سعید ہرگز معافی کے قابل نہ تھا۔ اِس مصیبت میں سعید کے خیالات کے تاریک اُفق پر رہ رہ کر زبیدہ کا درخشندہ چہرہ نمودار ہوتا اور اُس کے دل کو اُمید اور محبت کی شعاعوں سے منور کر دیتا تھا۔ لیکن وہ زبیدہ کے پاس جانے سے گھبراتا تھا۔ اُسے اپنی کمتری اور بے کسی کا احساس اس شدت سے ستا رہا تھا کہ وہ ڈرتا تھا کہ مبادا زبیدہ اُسے شرفِ ملاقات بخشنے سے انکار کر دے۔ اُس نے سنا تھا کہ زبیدہ نے پردہ ترک کر دیا ہے اور آج کل اپنے خاوند کے ہمراہ شملہ میں مقیم ہے۔ سعید کا ایک عزیز دوست بہ سلسلۂ ملازمت شملہ میں تھا اور سعید کی رہائی کے بعد اُس نے سعید کو دعوت دی تھی کہ گرمیوں کا موسم اُس کے پاس بسر کرے۔ چنانچہ سعید یہ سوچ کر کہ کچھ عرصہ پہاڑ پر قیام کرنے سے اُس کی صحت بہتر ہو جائے گی شملہ چلا گیا۔

مال پر اُسی طرح کھڑے کھڑے وہ شملہ کے تموّل اور حُسن کے بوقلموں نظارے دیکھ دیکھ کر اپنی حالت پر کافی غور کر چکا تھا۔ مختلف خیالات اُس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر آزادیٔ وطن کی تحریک اس قدر کمزور تھی تو اُس نے کیوں قید و بند کی مشقتیں جھیلیں۔ اگر اُس کے ہم وطن ملکی ضروریات سے اس قدر غافل

اور قومی مصائب سے اس قدر بے پرواہیں تو اُس نے کیوں جلتی آگ میں کُود کر اپنے مستقبل کو تباہ کیا۔ اُس کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے اور بعض اوقات وہ تحریکِ حریّت کو ایک بے معنی ہاؤ ہو سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ انہی خیالات میں محو وہ سڑک پر جا رہا تھا کہ سامنے زبیدہ آ گئی۔ سعید نے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن زبیدہ نے دیکھ لیا۔ چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد زبیدہ نے اُس کو اپنے مکان کا پتہ بتایا اور تاکید سے اُس کو وہاں آنے کی دعوت دی۔

دوسرے روز زبیدہ کے مکان پر جو باتیں ہوئیں اُنہوں نے سعید کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے۔ سعید کی مایوسی اور افسردگی کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اُس کے کان محبت اور ہمدردی کی آواز سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اُس کے تکدّر و اضمحلال کا ایک بہت بڑا باعث یہ بھی تھا کہ آلامِ روزگار کے ہجوم میں اُسے کہیں سے تسکین وتشفّی کا پیغام نہ ملتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جو لوگ کسی زمانے میں اُس سے محبت کرتے تھے اب اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ احساس روز بروز قوی ہو کر اُسے خود اپنی نگاہ میں پست کر رہا تھا۔ زبیدہ نے سعید کی بیوی کا ذکر کرنے سے عمداً گریز کیا۔ اُسے واقعات کا علم تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ قصہ چھیڑ کر سعید کے دل کے سب سے نازک حصّے کو تکلیف پہنچائے۔ سعید اپنے زمانۂ اسیری کے حالات سناتا رہا۔ سیاسی بحران اور اُس کے بعد کے واقعات پر بحث ہوتی رہی۔ ملک کی موجودہ کیفیت اور اپنے غیر یقینی مستقبل کے

متعلق بھی سعید نے اندیشہ و اضطراب کا اظہار کیا۔
زبیدہ نے یہ دیکھ کر کہ سعید بے حد مایوس ہو رہا ہے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم بار بار کیوں کہتے ہو کہ دنیا سے محبت اور وفا کا وجود مٹ گیا ہے یہ خیال بار بار کیوں دماغ میں لاتے ہو کہ تم نے ترکِ موالات کی تحریک میں شامل ہو کر دُور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا؟ کون کہتا ہے کہ ملک ایک دن میں آزاد ہو جائے گا یا قوم ایک دن میں غلامی کی زنجیریں کاٹ سکتی ہے؟ یاد رکھو یہ ایک طویل جدوجہد ہے جو خدا ہی جانتا ہے کب تک جاری رہے گی یہ ایک طوفان ہے جس میں نہیں معلوم کب تک نئے نئے مدوجزر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہزاروں جوان اپنی جوانیاں قربان کریں گے۔ لاکھوں انسان اپنی زندگیاں نچھاور کریں گے۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے۔ حکومت کی بنیادیں متزلزل ہوتے ہوتے اور نظامِ کہنہ کی دیواریں گرتے گرتے زلزلے اور فتنے پیدا کریں گی۔ خون کی ندیاں بہہ بہہ کر وطن کی مقدس سرزمین کو گرد و غبار سے صاف کر ڈالیں گی اور پھر کہیں آزادی کا آفتاب طلوع ہو گا۔ کیا تمہارے لئے یہ اعزاز قابلِ فخر نہیں کہ تم حریت طلب جماعت میں سب سے پہلے شریک ہو گئے ہو؟ پانی کا بے مقدار قطرہ سمندر میں مل کر بحرِ بے پایاں کا لقب اختیار کر لیتا ہے اور ریت کا حقیر ذرہ ریگ زار میں سماتا ہے تو صحرا بن جاتا ہے۔ تم بھی آزادی کی جنگ میں حصہ لے کر انفرادیت کے محدود حلقے سے نکل کر قوم کی اجتماعی قوت کی صورت اختیار

کر گئے ہو اور یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کس درد اور پریشانی کے ساتھ یہ دو سال گزارے ہیں۔ میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں مانگا کرتی تھی کہ تمہارے ارادے کی مضبوطی اور تمہاری ہمت کی بلندی قائم رہے۔ جانسپاری اور سرفروشی کا جو مسلک تم نے اختیار کیا ہے خدا اُس میں استقامت بخشے۔ میں اگر اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں تو تم شاید سمجھ سکو کہ دنیا میں محبت اور وفا کا وجود باقی ہے یا یہ متاعِ گرانمایہ ختم ہو چکی ہے۔ میں نے پردہ ترک کر دیا کہ تمہاری غیر حاضری کے یہ دو برس کسی مفید کام میں صرف کر سکوں۔ میں نے ایک زنانہ مدرسہ قائم کر کے دن رات محنت کی۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے، سلائی کا کام کرنے اور دستکاری سکھانے سے میں نے دو ہزار کی رقم جمع کی کہ جب تم قید سے نکل کر آؤ تو میں ہر خوشی سے تمہارا خیر مقدم کر سکوں۔ دنیا میں ایک ہی دل ہے جس میں تمہاری محبت ایمان کے درجے تک پہنچ چکی ہے۔ ایک ہی زبان ہے جس کا وظیفۂ حیات تمہارا نام ہے۔ تم جہاں بھی رہو گے اِس دل کی تمنائیں اور اِس زبان کی دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

سعید بے جان بُت کی طرح گُم سُم پتھرائی ہوئی آنکھوں اور گھبرائے ہوئے حواس کے ساتھ سب کچھ سُن رہا تھا۔ وفورِ جذبات سے اُس کے دل میں ایک طوفان اُٹھا اور پھر ساون کے مینہ کی طرح اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہو گئی

وہ زبیدہ کے مکان سے نکلا تو اُس کے سامنے ایک اور ہی دنیا تھی۔ حزن وملال اور اندوہ ویاس کے بادل چھٹ چکے تھے اور اُفق سے روشنی کی کرنیں پھُوٹ پھُوٹ کر شاہراہِ حیات کو منّور کر رہی تھیں۔ اُسے منزلِ مقصود کے کنگرے صاف نظر آرہے تھے۔

خوشبودار خط

خوشبودار خط

لاہور سے اُن دنوں ایک ہفت روزہ اخبار "ماہتاب" نکلتا تھا اور میں اُس کا ایڈیٹر تھا۔ رہنے کا انتظام میں نے مغلپورہ میں کر رکھا تھا میرے ایک عزیز بہ سلسلۂ ملازمت وہاں مقیم تھے اور میں اور وہ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔

لاہور میں مکانوں کے خوفناک کرائے، قیام و طعام کے بے اندازہ مصارف اور دیگر اسباب معیشت کی گرانی نے ہم ایسے کم استطاعت لوگوں کو مجبور کر دیا تھا کہ کام کے مقررہ اوقات تو لاہور میں بسر کریں اور سر چھپانے کے لئے لاہور کے مضافات میں کوئی گوشہ تلاش کیا جائے۔ صبح ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے میں لاہور آجاتا اور شام کو چار پانچ بجے واپس چلا جاتا تھا۔ ڈیڑھ سال تک یہی معمول رہا۔

اتفاق کی بات ہے کہ مغلپورہ سے گاڑی کے جس ڈبے میں میں سوار ہوتا تھا۔ اُس میں باقی مسافروں کے علاوہ ایک نوجوان ہر روز موجود ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں نے خیال نہ کیا لیکن چند ہفتوں کے بعد ہم ایک دوسرے کی شکل و صورت سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ یہ نوجوان لاہور کے اسٹیشن پر

اُتر جانا تھا اور شام کو غالبًا واپس چلا جاتا ہو گا۔ آہستہ آہستہ روشناسی بڑھتی گئی اور پھر خود بخود علیک سلیک شروع ہو گئی۔

دفتر جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت میرے پاس مختلف اخبارات و رسائل کا ایک بلندہ ہوتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے کبھی کوئی مسافر گھڑی بھر کے لئے اخبار مانگ لیتا تھا۔ اسی طرح یہ نوجوان بھی گاہے گاہے ایک آدھ پرچہ اُٹھا کر پڑھ لیتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ہمارے درمیان ملک کے سیاسی حالات اور عام اقتصادی مسائل کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ ہماری ملاقات کی میعاد ہر روز صرف دس منٹ ہوتی تھی۔ ادھر گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر پہنچی اور ہم خدا حافظ کہہ کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ پھر یہ صورت ہو گئی کہ جس طرح روزمرہ پروگرام کے مطابق بعض باتیں اپنے وقت پر ہوتی ہیں اور ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کا منتظر رہتا ہے۔ ہم بھی ہر روز صبح نو بجے ایک دوسرے کی ملاقات کے منتظر رہنے لگ گئے لیکن لاہور آیا اور پھر نہ ملاقات کی یاد باقی رہی اور نہ انتظار میرے نام سے وہ واقف ہو چکا تھا اور میرے مشاغل کی نوعیت بھی اُسے معلوم تھی لیکن میں نہ اُس کے نام سے واقف تھا اور نہ کام سے۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ہر روز امرتسر سے آتا اور شام کو واپس چلا جاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ کئی روز تک نظر نہ آیا اور میں نے اپنی غلطی کا احساس کیا کہ کم از کم اُس کے نام اور پتے سے تو آگاہ ہو جانا چاہیے تھا۔ پانچ سات روز غائب رہنے کے بعد جب وہ دوبارہ ملا تو معلوم ہوا کہ اُسے بخار کی شکایت تھی۔

اُس کا نام اشفاق تھا اور وہ ایک بیمہ کمپنی کے دفتر میں کسی اچھی جگہ ملازم تھا۔ چار بجے کام سے فارغ ہو کر واپس امرت سر چلا جاتا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی تھا جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے اُس کے خدوخال میں کوئی موزونی نہ تھی لیکن اُس کے بُشرے کا مجموعی اثر بہت دلپذیر تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش کو اگر الگ الگ دیکھا جائے تو شاید اُسے خوبصورت کہنا روا نہ ہو گا۔ لیکن اُس کی شکل میں ایک ایسی نرمی اور اس کے چہرے پر ایک ایسی ملائمت تھی کہ دل خواہ مخواہ اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ ایسا عزلت پسند اور خاموش انسان تو نہ تھا لیکن اُس کی آنکھوں سے جس کیفیت کا اظہار ہوتا تھا۔ اُس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تصوّر و تخیل کی دنیا میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بعض اوقات یونہی فضا میں حرکت کرتی معلوم ہوتی تھیں کبھی کبھی اُس کے اندرونی اضطراب کا عکس اُس کے چہرے پر پڑتا تو اُس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی۔ اور پھر فوراً ہی اُس کے ہونٹوں پر تبسم اور اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ شاید اُس کے دل کی لحظہ بہ لحظہ بدلنے والی حالت کے اثرات تھے۔

وہ علی گڈھ کا تعلیم یافتہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اُس کے لب و لہجہ میں کرختگی نام کو نہ تھی۔ ادبیات سے اُسے بہت شغف تھا اور ہمارے درمیان جلد ربط و ضبط قائم ہو جانے کا باعث بھی یہ تھا کہ ہماری گفتگو سیاسی اور اقتصادی مسائل سے ہٹ کر ادبیات پر آٹھیری تھی۔ وہ علی گڈھ کی روشن خیالی اور تجدد پسندی کے باوجود شعر و

سخن کے معاملے میں کسی حد تک قدامت پرست واقع ہوا تھا اور پنجاب کے شعراء کی خیال آرائیوں کو چنداں استحسان کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ میں اکثر مذاق کے طور پر اُس سے کہتا کہ "جدید تحریکِ ادب کو یو۔پی میں کبھی فروغ نہیں ہو سکتا۔"

وہ حیران ہو کر پوچھتا "کیوں؟"

میں جواب دیتا "جب آپ کے مذاق کا یہ عالم ہے کہ علی گڑھ جیسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی درسگاہ میں چار سال بسر کرنے کے بعد بھی آپ اُسی روش کو سراہتے ہیں جو لکھنؤ میں ناسخ اور دہلی میں ذوق قائم کر گیا ہے تو پھر اُن لوگوں کا ذکر ہی جانے دیجئے جن کا خمیر سراسر یو۔پی کی سرزمین سے اُٹھا ہے۔"

وہ ناسخ کا نام سُن کر ہنس دیتا "آپ خواہ مخواہ مجھے ناسخ کا مداح بنا رہے ہیں میں تو اُس رنگِ سخن کا سخت مخالف ہوں جس نے لکھنؤ کی شاعری کو اساتذۂ دہلی کے کلام سے الگ کیا ہے۔ لیکن میں یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ زبان کے مسئلے کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔ نظم ہو یا نثر صحتِ زبان ہر صورت مقدم ہے اور جو شخص زبان پر پوری قدرت نہیں رکھتا وہ نہ اچھا شاعر بن سکتا ہے اور نہ اچھا ادیب۔ آج یہ حالت ہے کہ ہر مبتدی محاورے کی خلاف ورزی اور اصولِ زبان سے انحراف کو ادبی اجتہاد کے نام سے پکارتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ عہدِ حاضر کا لکھنؤ عہدِ انیس کا لکھنؤ نہیں اور موجودہ زمانے کی دلّی بھی میر و غالب کے وقت کی دِلّی نہیں لیکن زبان کے وہ محاورے اور ادب و انشاء کے وہ قواعد جو ہمارے اُن بزرگوں کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن کا وجود آج بھی ہمارے

ادب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے کیونکر نظر انداز کئے جا سکتے ہیں۔ مرکزیت کے مٹ جانے سے یہ مراد نہیں کہ اب زبان کے مروجہ و مسلمہ اصولوں کے خلاف ہر بغاوت کو اصلاح پسندی اور روشن خیالی سے تعبیر کیا جائے۔ اگر یہ رَوِش چل نکلی تو نااہل لوگ اپنی بے مائگی کو چھپانے کے لئے زبان پر ہر قسم کے ظلم روا رکھیں گے"

ایک دن وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر سہ پہر کے وقت میرے دفتر میں آگیا اور کہنے لگا "کل اتوار ہے۔ چھٹی کا روز ہے۔ میری صلاح ہے آج امرتسر نہ جاؤں۔ رات کو سینما دیکھیں اور کل تمام دن سیر و تفریح کی نذر کیا جائے۔ کیا رائے ہے آپ کی؟"

میں نے کہا "مجھے اتفاق ہے۔ رات سینما دیکھ کر مغلپورہ چلئے۔ وہاں غریب خانہ حاضر ہے اور کل دن بھر سیر سپاٹا کیا جائے۔ آپ کے آنے سے پہلے میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ ہفتے بھر کی کوفت رفع کرنے کے لئے اتوار کو مکمل تفریح ہونی چاہئے"۔

ہم رات کو نو بجے سینما سے فارغ ہو کر جب گھر کی طرف چلے تو فلم کے حسن و قبح پر بحث شروع ہو گئی۔ اشفاق کہنے لگا "میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ایک عورت محبت کے معاملے میں مرد کو کیونکر بے وقوف بنا سکتی ہے۔ مانا کہ دورِ حاضر کی ہندوستانی عورت نے تہذیبِ مغرب سے متاثر ہو کر کسی حد تک متلون مزاجی، وفانا آشنائی اور ظاہر پرستی سیکھ لی ہے۔ لیکن ہندوستان کے مرد نے بھی تو یہ خصوصیات حاصل کرنے میں

کمی نہیں کی۔ پھر جب فریقین کی حالت یکساں ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ عورت مرد کو فریب دے جاتی ہے۔ اِس فلم میں بھی عورت کے مزاج کا یہی پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عورت اور مرد دونوں تعلیم یافتہ ہیں۔ دونوں جدید معاشرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور دونوں نے مشرق و مغرب کے اتصال سے جو خوبیاں یا برائیاں پیدا ہوئی ہیں اختیار کر رکھی ہیں۔ مرد سب کچھ جان بوجھ کر، دیکھ بھال کر، عورت سے محبت کرتا ہے اور عورت اُسے دھوکا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتی ہے۔ کیا مرد ایسا ہی معصوم اور عورت ایسی ہی فریب کار ہے؟"

میں نے کہا "عورتیں نیک بھی ہوتی ہیں اور بد بھی۔ اسی طرح مرد شریف بھی ہوتے ہیں اور مکار بھی۔ افسانہ نگار نے فلم میں اپنے ذاتی خیالات و تجربات کا اظہار کیا ہے اور ہم غلطی سے اُسے ایک عالمگیر صداقت سمجھ رہے ہیں عشق و محبت کی دنیا میں ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے اور جب اُس تجربے کو رنگ آمیزی کے ساتھ ایک کہانی کی شکل میں بیان کیا جائے تو لوگ اُسے اِس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے کہ وہ محض ایک شخص کی ذاتی روئداد ہے بلکہ وہ اُسے ایک مسلمہ حقیقت یقین کر لیتے ہیں۔"

ارادہ تو یہی تھا کہ اتوار کو جی بھر کر آوارہ گردی کریں گے لیکن ہوا یہ کہ صبح اُٹھے، ناشتہ کیا اور پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو ایک نہیں، دو نہیں، اکٹھے پانچ گھنٹے ہم نے اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا اور گفتگو جاری رہی۔ دو بجے سے چار بجے تک ہم نے چھاؤنی کی سڑکوں اور صدر بازار

کا ایک چکر لگایا اور ساڑھے چار بجے کی گاڑی سے اشفاق صاحب واپس امرت سر چلے گئے۔

آج اشفاق نے اپنے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ اُس کے والدین کا مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بہن بھائی بھی کوئی نہیں تھا۔ امرت سر میں اُس کا ایک جدّی مکان تھا جس میں وہ اپنے چند قرابت داروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسکول کی تعلیم اُس نے لدھیانہ میں ختم کی تھی جہاں سے وہ علی گڈھ چلا گیا اور بی اے تک وہیں رہا۔ لاہور میں اُس کی واقفیت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اپنے دفتر کے آدمیوں کے سوا اور کسی سے اُس کی راہ و رسم نہ تھی۔ سالہا سال سے ایک ہی قسم کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے وہ تنہائی کا عادی ہو گیا تھا۔ تاہم وہ اپنی بے آب و رنگ زندگی میں کیف و تنوّع پیدا کرنے پر آمادہ تھا اور کیف و تنوّع کی اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی کہ متاہل زندگی اختیار کر لی جائے۔ شادی کے متعلق اُس کے خیالات مبہم، غیر معیّن اور اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ چونکہ تنہا تھا اور خاندانی علائق اور گھر بار کی پابندیوں سے بے نیاز تھا۔ اس لئے شادی کے رسم و رواج سے بھی بے خبر تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی شادی کے متعلق کچھ فیصلہ کر چکا ہے لیکن اُس کے اظہار سے گریز کرتا ہے۔ میرے استفسار پر کہ آیا شادی کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اُس نے کہا۔ ہماری معاشرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک خاص عمر پہ پہنچ کر ہر زن و مرد کو سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہیئے ورنہ اُس کے بعد ناکتخدا رہنے والوں کو سوسائٹی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کنواروں پر ٹیکس عائد کیا جا رہا

ہے۔ اُن کے اخلاق اور چال چلن کو خواہ مخواہ مُشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اُنہیں شہر کے آباد محلوں اور گلی کوچوں میں رہنے کو مکان نہیں دیئے جاتے۔ بھلے آدمیوں کے ہاں اُن کی آمد و رفت معیوب خیال کی جاتی ہے۔ ان باتوں سے تنگ آ کر لوگ شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور پھر ستم ظریفی دیکھو کہ ہر شادی شدہ شخص کو دنیا بڑی فراخ دلی سے نیک چلنی کا پروانہ دے دیتی ہے۔ اعمال و افعال کی چھان پھٹک ختم ہو جاتی ہے اُس کے ماضی اور ماضی کے ساتھ تعلق رکھنے والے عیب و ثواب کی پوچھ گچھ بھی ترک کر دی جاتی ہے۔ گویا عزت و اعتبار اور قدر و منزلت کے حصول کا بہترین ذریعہ شادی ہے"۔

میں نے کہا "جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ شادی کا رسمی پہلو ہے۔ لیکن اُس شادی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو عشق و محبت کا کامیاب ثمر ہوتی ہے"۔

اشفاق خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا "آپ خاموش کیوں ہو گئے"؟

اُس نے آب دیدہ ہو کر کہا "یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو ہندوستان میں کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے"۔

ہمارے تعلقات روز بہ روز بڑھتے گئے۔ ایک آدھ مرتبہ میں بھی امرت سر گیا اور اشفاق کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ گاڑی میں ہر روز ملاقات ہوتی تھی

اشفاق کی جیب میں چمڑے کا ایک نہایت خوبصورت بڑا سا بٹوا رہتا تھا جس میں روپے پیسے کی بجائے وہ کچھ کاغذات رکھتا تھا۔ ایک روز اتفاقیہ وہ بٹوا جیب میں سے گر گیا۔ اور تمام کاغذات زمین پر بکھر گئے۔ اُن میں چند گلابی رنگ کے نرم و نازک حسین لفافے بھی تھے جن کے کونوں پر بہت خوشنما پھول بنے ہوئے تھے۔ ہر لفافے پر خوبصورت زنانہ خط سے اشفاق کا پتہ مرقوم تھا اور اندر سے عطر کی خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں میں نے وہ لفافے اٹھا کر اشفاق کو دیئے تو اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا میں نے ہنس کر کہا "ان لفافوں کا لکھنے والا بھی ایسا ہی معطّر و حسین شخص ہو گا؟"

اشفاق جھینپ سا گیا اور بٹوا اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر مجھ سے رازداری کے لہجے میں کہنے لگا "میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے کا ہر روز ارادہ کرتا ہوں لیکن جرأت نہیں ہوتی"۔

میں نے کہا "فرمائیے۔ کیا ضروری بات ہے؟"

اشفاق نے کہا "انہی لفافوں کے متعلق"۔

اور پھر احتیاط سے ایک لفافہ جیب سے نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے کھولا تو وہ ایک خط تھا، کسی عورت کی طرف سے، جس نے اپنا پورا نام لکھنے کی بجائے صرف "س" لکھا ہوا تھا۔ میں نے خط پڑھا تو معلوم ہوا کہ حسن و عشق کی ایک دلچسپ داستان ہے۔ فراق کی کاہشیں، فلکِ کج رفتار کے مظالم، جورِ اعدا کے گلے، دلِ غم نصیب کے سنبھلنے کی دعائیں، غرضکہ صحیفۂ عشق کے تمام باب قلمبند کئے

گئے تھے۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ مجھ پر آپ نے جو اعتماد فرمایا ہے۔ اُس کا بے حد شکریہ لیکن یہ بتائیے کہ یہ خاتون کون ہیں؟"

اشفاق نے پھر بٹوا کھولا اور تمام خطوط نکال کر میرے حوالے کر دیئے۔ بھینی بھینی مست کر دینے والی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "عورتوں کو خوشبو استعمال کرنے میں بھی غضب کا سلیقہ حاصل ہے۔ ہم چاہے پوری شیشی خالی کر ڈالیں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔"

اشفاق کے چہرے پر خوشی اور کامیابی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

میں نے وہ تمام خطوط پڑھے۔ وارداتِ عشق کی ایک رنگین روداد تھی لیکن میں نے ایک نامعلوم طریقے سے محسوس کیا کہ خطوں میں محبت کی حقیقی گرمی موجود نہیں۔ جگہ جگہ اشعار استعمال کئے گئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جذبات کی کمی ہے اور لکھنے والی اپنی سرد مہری کو اشعار کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

"اب ان خطوں کی تفسیر بھی کر دیجئے۔"

اُس نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہر تصنیف کا بہتر شارح خود اُس کا مصنف ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اس تصنیفِ لطیف کے مصنف کی بارگاہِ ناز تک مجھے اپنے ہمراہ لے چلنے کے لئے آپ تیار ہیں؟"

اشفاق نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا "فکر نہ کیجئے۔ وہ دن بھی قریب آرہا ہے"۔

اور پھر اُس نے مزے لے لے کر کہنا شروع کیا "س سے مراد سکینہ ہے یہ ایک نہایت حسین و جمیل اور شائستہ خاتون ہیں۔ اپنی والدہ کے ہمراہ لاہور میں رہتی ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے اُن کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل ہے اور میں کس مُنہ سے کہوں کہ عنقریب میری اُن سے شادی ہونے والی ہے"۔

میں نے متعجب ہو کر کہا "خوب۔ آپ تو چُھپے رُستم نکلے۔ چپکے چپکے شکار مار لیا لیکن اگر آپ میری جرأت کو قابلِ مواخذہ تصوّر نہ فرمائیں تو کیا میں اتنا پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خاتون کس خاندان سے ہیں؟"

اشفاق گھبرا گیا اور قدرے توقّف کے بعد بولا "مجھے اِس سوال کا جواب دینے کی ممانعت ہے اور یوں بھی یہ معیوب سی بات ہے کہ میں اِس وقت اُن کے گھر بار کا پتہ آپ کو بتا دوں۔ تاہم آپ کی تشفّی کے لئے اتنا کہے دیتا ہوں کہ وہ ایک نہایت ذی عزت گھرانے کی چشم و چراغ ہیں اور اُن کے والد کے انتقال کے بعد اُن کی والدہ نے پوری شفقت و محبت اور بے حد حزم و احتیاط سے اُن کی پرورش کی ہے"۔

پھر وہ مجھے اپنی شادی کے اہتمام و انصرام کی تفصیلات سنانے لگا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میں تنہا ہوں اور رسم و رواج سے ناواقف ہوں۔ اس لئے میں نے

سکینہ کی والدہ سے کہہ دیا ہے کہ میری طرف سے بھی شادی کا انتظام وہی مکمل کر دیں۔ میں نے سرِدست سات سو روپیہ انہیں دیا ہے اور اب ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے ستر روپے اُن کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ خود ہی زیور اور کپڑے وغیرہ تیار کر رہی ہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ نکاح جلد ہو جائے لیکن سکینہ کی والدہ نہیں مانتیں وہ کہتی ہیں کہ میں اپنی لڑکی کا رخصتانہ دھوم دھام سے کروں گی۔"

اِس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے روز اشفاق نے پھر وہ بٹوا جیب میں سے نکالا اور کہنے لگا "اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ میں آپ کو سکینہ کی تصویر دکھاتا ہوں"

اُس نے بٹوا کھول کر ایک باریک سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر نکالی اور میں نے سخت اضطراب سے وہ تصویر اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ جونہی میری نظر اُس پر پڑی میرا رنگ فق ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا چند لمحوں کے لئے میرے دل کی حرکت رُک گئی ہے۔ اشفاق حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر میرا شانہ ہلا کر بولا "کیا ہوا آپ کو؟ خیر تو ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ مجھے دل کا عارضہ ہے۔ کبھی کبھی یک لخت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دل ڈوب رہا ہے۔"

یہ تصویر شمشاد کی تھی جو اِس سے قبل کم از کم چھ نوجوانوں کو تباہ کر چکی تھی۔ اُس کی ماں زینت ایک سخت عیار اور آوارہ عورت تھی جس کا پیشہ ہی یہ تھا کہ اپنی لڑکی کے ذریعے سے سادہ لوح نوجوانوں کو لوٹے۔ اِن کے ترکش کا زخم خوردہ میرا

ایک دوست لطیف احمد بھی تھا لیکن اُس وقت یہ دونوں ماں بیٹی راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ لطیف کو شمشاد کی شادی کا چکمہ دے کر انہوں نے مختلف بہانوں سے اُس سے بارہ سو روپیہ وصول کیا اور پھر راولپنڈی سے غائب ہو گئیں۔ میں لطیف سے کہتا رہا کہ پولیس میں اطلاع کر دو لیکن اُس نے اپنی رسوائی کے ڈر سے اور کچھ اس خیال سے کہ اُس کے پاس ثبوت نہیں تھا پولیس میں خبر نہ کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ شمشاد نے اپنی ایک تصویر لطیف کو دی تھی اور وہ تصویر مدت سے میرے پاس پڑی تھی میں گھر آ کر سوچتا رہا کہ اشفاق کو اِس خطرناک سازش کی خبر کس طرح کروں "تاکہ اُس کی حساس طبیعت کو زیادہ صدمہ نہ پہنچے۔ وہ بچارا خوشبودار خطوں، شمشاد کے حسن و جمال کی دلفریبیوں اور زینت کی طرحدار باتوں کے جال میں بُری طرح پھنس چکا تھا۔ اور اب اگر اُسے معلوم ہوا کہ یہ سب فریب تھا تو خدا جانے وہ اپنا کیا حال کر بیٹھے میں نے اُسے ایک مفصل خط لکھا جس میں شمشاد اور زینت کی عیاری کی تمام داستان درج کی اور اپنے بیان کو زیادہ موثق بنانے کے لئے شمشاد کی تصویر بھی اُسے بھیج دی۔ دوسرے روز خط پہنچتے ہی وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور وہ خود سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا "کیا آپ نے یہ خط لکھا تھا؟"

میں نے جواب دیا "ہاں"!

"کیا یہ ساری داستان صحیح ہے؟"

میں نے عرض کیا "اس کا ایک ایک لفظ درست ہے"

"تو پھر میں اب کیا کروں؟"

میں نے جواب دیا "میری رائے ہے کہ آپ اس واقعہ کی پولیس میں اطلاع کر دیں"۔

وہ کہنے لگا "میں پولیس میں اطلاع نہیں کروں گا۔ دُنیا میں اس طرح اپنی تشہیر کرنا مجھے گوارا نہیں۔ میرے پاس روپے کا کوئی ثبوت نہیں سے دے کے یہ چند خطوط ہیں۔ ان سے بھی کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے مجھ سے اتنی رقم وصول کی ہے"!

آدھ پون گھنٹہ ہمارے درمیان گفتگو ہوتی رہی اور اشفاق آئندہ طرزِ کار کے متعلق کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد دو روز مسلسل وہ مجھے گاڑی میں نظر نہ آیا۔ میں نے اُس کے دفتر سے خبر منگوائی تو معلوم ہوا کہ بیمار ہے۔ میں خود اُسے دیکھنے کے لئے امرتسر گیا۔ اُس کو بہت تیز بخار تھا اور ساتھ ہی تمام بدن میں شدید درد تھا۔ میں نے کہا "آپ بیمار کیونکر ہو گئے؟"

اُس نے بہت کمزور آواز میں جواب دیا "اُس روز آپ سے مل کر جب میں واپس آیا تو سر میں سخت درد تھا۔ رات بھر ایسی بے چینی رہی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ صبح ہوئی تو بخار ہو گیا"۔

میں نے اُس کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُس

واقعہ سے بہت زیادہ متأثر ہوئے ہیں۔ آپ کے اعصاب میں کچھ ایسی ذکاوتِ حس ہے کہ ہر ناگوار واقعہ آپ پر غیر معمولی گہرا اثر ڈالتا ہے۔"

اس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا اور خاموش ہو گیا۔

اشفاق کا بخارتپِ محرقہ کی صورت اختیار کر گیا اور غریب پورے اکّیس روز چارپائی پر پڑا رہا۔

چاریاری

چار یاری

ہوٹل میں تقریباً ہر روز شام کے کھانے کے بعد ایک لمبی نشست ہوتی تھی۔ بعض لوگ کھانا کھا کر یوں ہی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے تھے۔ کبھی کبھی سامنے کالج کے ہوسٹل سے طلبہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ صرف چائے پیتے یا ہماری باتیں سُنتے تھے۔ اِس بات کا احساس کہ وہ اپنے ہم عمر و ہم مکتب ساتھیوں کی گفتگو میں نہیں بلکہ جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ لوگوں کی مجلس میں شریک ہیں۔ اُن کے اندر ایک خاص قسم کی برتری کا جذبہ پیدا کر دیتا تھا شام کی یہ محفل ہوٹل کی معاشرتی زندگی کا ایک ایسا نمایاں اور دلآویز پہلو بن گیا تھا کہ اُس کی ہنگامہ خیز رونق ہمارے لئے کھانے سے زیادہ ضروری تھی۔

ڈاکٹر یزدانی جنھیں نامعلوم طریقے سے اس مجلس کی غیر رسمی صدارت کے فرائض حاصل ہو چکے تھے۔ ایک طبیب تھے جو بیک وقت یونانی اور ہومیوپیتھک طریق علاج کے ماہر تصوّر کئے جاتے تھے۔ ہر چند کہ اُن کی شفا بخشیوں کا دائرہ اس قدر محدود تھا کہ شاید ہزار میں سے دو آدمی بہ مشکل اُن سے صحت یاب ہوتے ہوں گے۔ ڈاکٹر یزدانی مستقل طور پر ہوٹل میں مقیم تھے اور اُن کا مطب شہر کے اُس حصّے میں واقع تھا جہاں دھوبی، مزدور، چمار اور شاگرد پیشہ لوگوں کی آبادی

زیادہ ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طبقے کے لوگ خوش عقیدہ ہونے کے علاوہ اپنے معالج کے احکام کی تعمیل اُسی وفاداری سے کرتے ہیں جس طرح ایک مرید اپنے مرشد ہدایت کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ اگرچہ اُنہیں اپنی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی تھی۔ بظاہر وہ یہی کہتے سنے جاتے تھے "میں طب جیسے شریف اور معزز فن کو دکانداری بنانا گناہ سمجھتا ہوں میں تو چاہتا ہوں کہ غریبوں کی خدمت کروں آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنا مطب بھی ایسی جگہ کھول رکھا ہے۔ جہاں مجھے تنگ دست محتاج اور مفلوک الحال لوگوں کی خدمت کے موقعے زیادہ ملتے ہیں۔ اُمراء اگر بیمار پڑیں تو انہیں روپیہ پانی کی طرح بہانے میں کیا دریغ ہو سکتا ہے لیکن غریبوں کی خدمت ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو اپنا پتہ مار چکا ہو"۔

جمال احمد جوہر لوگوں میں صرف جمالی کے نام سے مشہور تھے ہوٹل کی ایک اور نمایاں شخصیت تھے۔ یہ گریجوایٹ تھے اور رہنے سہنے اور خوش پوشی میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ ان کا مستقل قیام بھی ہوٹل میں تھا۔ یہ ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ تھے اور انگریزی لکھنے اور بولنے میں اُنہیں بہت ملکہ حاصل تھا۔ جمالی کا قد لمبا اور رنگ سانولا تھا لیکن کپڑے پہننے کا انہیں ایسا سلیقہ تھا کہ لباس کی سج دھج سے اُن کی رنگت بھی نکھر جاتی تھی۔ بلکہ بعض دفعہ تو ہم کہہ اُٹھتے تھے کہ "اگر جمالی کے ہاں صباحت زیادہ ہوتی تو شاید اُس کی جامہ زیبی

کم ہو جاتی

جمالی اچھا بذلہ سنج اور خوش گفتار شخص تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اُس کی خوش کلامی اُس کے روزگار میں اُس کی مدد نہ کرتی تھی۔ اپنے پیشے کے اعتبار سے وہ چنداں کامیاب نہ تھا۔ جب کہیں چار آدمی جمع ہوتے وہ بیمے کے فوائد اور اپنی کمپنی کی عظمت و وسعت کے قصے لے بیٹھتا تھا۔ ہم ہمیشہ اُس سے کہتے تھے کہ کونین کی گولی کو شکر میں لپیٹ کر دینے سے اُس کی تلخی کم ہو جاتی ہے۔ تم بھی حرفِ مطلب زبان پر لانے سے پہلے میٹھی میٹھی باتوں کا جال پھیلا لیا کرو۔"

لیکن وہ اس بارے میں ہم سے مختلف رائے رکھتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کاروباری معاملات میں ہمیشہ صاف سیدھی اور دو ٹوک بات ہونی چاہیئے۔ جمالی گاہے گاہے شام کو مے و مینا کا شغل بھی کرتا تھا اور جب وہ عالمِ کیف میں لہک لہک کر باتیں کرتا تو اُس کی طبیعت کی شگفتگی اور زبان کی روانی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔

اِس مجلس کے ایک اور رُکن حضرت رسوا تھے۔ ان کا پورا نام مشتاق علی رُسوا تھا اور اردو کے ایک روزانہ اخبار کے عملۂ ادارت میں منسلک تھے۔ اُنھوں نے رہائش کا انتظام کہیں باہر کر رکھا تھا۔ اور کھانا دونوں وقت ہوٹل میں کھاتے تھے یہ تھے تو پنجاب کے ایک دور اُفتادہ گوشے کے باشندے لیکن اتفاق سے اُنہیں کہیں دو سال لکھنؤ کے مضافات میں بسر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اب وہ

اپنے لب و لہجہ میں نہایت کوشش سے لکھنوی رنگ پیدا کرتے تھے۔ اور پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لہجے پر اکثر ناک بھوں چڑھاتے رہتے تھے ان کو شعر و سخن کا بھی شوق تھا اور اپنا کلام ہمیشہ ترنّم سے پڑھ کر سناتے تھے۔ انہیں عموماً حلق کی خرابی کی شکایت رہتی تھی۔ اس لئے جب بھی اُن سے کلام سنانے کی فرمائش ہوتی تھی وہ اپنے حلق کی خراش کا ذکر چھیڑ کر معذوری کا اظہار کر دیتے تھے رُسوا دوہرے بدن کے اچھے مضبوط آدمی تھے۔ کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور شیروانی ان کا لباس تھا۔ سر پر کبھی کبھار ٹوپی پہنتے تھے اور شیروانی کے اوپر کے بٹن اکثر کھلے رہتے تھے۔ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر جب ان کی باتیں شروع ہوتیں تو کسی دوسرے آدمی کا بولنا محال ہو جاتا تھا۔ دن بھر کی خبریں سناتے، ہندوستان کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے اور ساتھ ساتھ بیرونِ ہند کے واقعات کا بھی جائزہ لیتے جاتے تھے۔ انہیں تنخواہ بہت بے قاعدگی سے ملتی تھی۔ اس لئے صحافت کے پیشے کو اکثر صلواتیں سنایا کرتے تھے لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ اخبار نویسی شراب، افیم اور چانڈو کی طرح ایک نشہ ہے جس کی عادت پڑ جائے تو ترک کرنا مشکل ہے۔ حال ہی میں اُن کے خیالات پر اشتراکیت کا رنگ چڑھ رہا تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اخبار کی ساری آمدنی اخبار کے مالک اپنے صرف میں لے آتے تھے اور کارکنوں کو فاقہ کرنا پڑتا تھا۔

ایک اور صاحب بدرالحسن تھے یہ ایک مقامی اسکول میں مدرّس تھے اور ٹدل

کی جماعتوں کو پڑھاتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے ہیڈ ماسٹر کی شکایت کرتے تھے اور زمانے کی قدر ناشناسی کا شکوہ بھی اُن کی زبان پر جاری رہتا تھا۔ انہیں اپنی قابلیت کا بہت زعم تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اسکول کی انتظامیہ انجمن کے اراکین جاہل ہیں اور لائق آدمیوں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ اُن کی طبیعت میں ظرافت کا عنصر کافی تھا۔ لیکن درس و تدریس کے بے کیف مشاغل کی وجہ سے اُس پر یبوست کی ایک تہ سی جم گئی تھی جس سے بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص خشک مزاج ہے۔ جب کبھی ہنسی مذاق کی باتیں شروع ہوتیں تو بدرالحسن کی فطری ظرافت کا جوہر چمک اٹھتا تھا اور وہ بڑھ بڑھ کر ایسے لطائف بیان کرتے کہ مجلس میں قہقہے بلند ہونا شروع ہو جاتے تھے۔

ہر روز اِدھر شام کا کھانا ختم ہوا اور اُدھر، گرمی ہو تو صحن میں اور سردی ہو تو آتشدان کے قریب، ہم نے کرسیاں بچھائیں اور ایک ایک کر کے یارانِ سرِپل آ کر جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر یزدانی طب کی عظمت کا راگ الاپ رہے ہیں اور اپنی حذاقت کے افسانے سنا رہے ہیں۔ شہر میں اگر کوئی وبائی مرض پھیل رہا ہے تو اُس کے اسباب اور اُس سے بچنے کی تدبیریں بتا رہے ہیں۔ کبھی کسی مریض کا قصّہ لے بیٹھتے ہیں تو سر اُونچا کر کے اور گردن ہلا ہلا کر اپنی تشخیص اور معالجات کی کامیابی کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں گویا مسیحائے زماں آپ ہی ہیں۔ اس دوران میں جمالی پکار اٹھتا ہے۔ سُبحان اللہ، آپ تو جالینوسِ وقت اور افلاطونِ دہر ہیں۔ میں حیران ہوں کہ حکومت نے اب تک آپ کی قابلیت کا اعتراف

کیوں نہیں کیا اور آپ کو حاذق الملک کا خطاب کیوں عطا نہیں ہوا۔ سچ ہے دنیا میں جوہر قابل کی قدر نہیں ہوتی۔ یزدانی صاحب، آپ دل میلا نہ کیجئے۔ آفتاب کب تک بادلوں کے نیچے چھپا رہے گا۔ اُس کی روشنی ایک نہ ایک دن عالم کو منوّر کر کے رہے گی۔"

پھر ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے ہماری طرف دیکھ کر جمالی کہتا "دوستو، کیا بتاؤں آج کل طب کا پیشہ کس قدر خراب ہو چکا ہے۔ بدنام کنندۂ نکونامے چند کی قسم کے ڈاکٹروں نے اس معزز فن کو بے حد ذلیل کر رکھا ہے۔ ابھی تو پچھلے دنوں ہماری کمپنی میں ایک فرضی شخص کا پچیس ہزار روپے میں بیمہ کرایا گیا اور کچھ عرصے کے بعد اُس شخص کی موت کی اطلاع دے کر کمپنی سے یہ رقم وصول کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک مشہور ڈاکٹر بھی اس سازش میں شریک تھا۔ کمپنی کے افسروں کو کسی طرح اس فرضی کارروائی کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا۔ تفتیش کے بعد مقدمہ عدالت کے سپرد ہوا تو ملزموں کو تین تین سال قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ ڈاکٹر بھی بڑے گھر جا پہنچا ہے۔ یوں تو خدا کسی پر بُرا وقت نہ لائے۔ لیکن یزدانی صاحب آپ ذرا احتیاط کیا کیجئے گا۔"

اتنے میں رسوا پان چباتے اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھانس کر کہتے "ارے بھئی جمالی یہ بیمے کا سارا کاروبار ہی فریب۔ آج کل جسے دیکھو بیمہ کمپنی بنائے بیٹھا ہے۔ سب سرمایہ داری کے ہتھکنڈے ہیں۔ یہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر جو اشتراکیت کا وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ بڑی بڑی بیمہ کمپنیوں کے مالک ہی تو ہیں۔ ہزاروں

روپیہ ماہوار وصول کرتے ہیں کمپنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ روپیہ غریبوں کا ہضم ہوتا ہے اور لوٹ مار کرنے والے ڈائرکٹر صاف بچ نکلتے ہیں۔ اس زمانے میں مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرنے والے اداروں کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ تمام دنیا کو لوٹو اور چند آدمی مل کر کھاؤ۔ میں تو تم سے یہ کہوں گا کہ اس کام کو چھوڑ دو۔ تم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے ماشاءاللہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر تمہیں قدرت ہے۔ کیوں نہیں اپنی قابلیت کے شایانِ شان کوئی معزز اور آزاد روزگار اختیار کرتے۔ صحافت کی اگرچہ ہندوستان میں اُتنی قدر و منزلت تو نہیں جتنی انگلستان میں ہے لیکن اِس گئی گزری حالت میں بھی اس پیشے کا وقار اور زور باقی سب پیشوں سے زیادہ ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تم اس طرف آجاؤ تو بہت کامیاب ثابت ہوگے، اور پھر اصل چیز تو عزت ہے۔ روپیہ عزت کے مقابلے میں کیا چیز ہے۔ ایک اخبار نویس کی طاقت کے سامنے بادشاہوں کو بھی جھکنا پڑتا ہے"۔

بدرالحسن جو اپنے شاگردوں کی کاپیاں اصلاح کے لئے ہوٹل ہی میں لے آیا کرتے تھے ایک طرف اپنے کام میں مصروف ہیں۔ سب کچھ سُن رہے ہیں لیکن انجان بنے بیٹھے ہیں۔ پھر یکایک سر اُٹھاتے اور ہنس کر کہتے ہیں "رسوا صاحب، آپ پھر وہی صحافت کا قصہ لے بیٹھے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ جس کو بھوکوں مرنا ہو وہ اخبار نویس بن جائے۔ جس کو گھر پھونک تماشا دیکھنا ہو وہ اخبار نویس بن جائے اور جس غریب کو جورو کا زیور بیچ کر سو فی صدی خسارے کے سودے میں روپیہ لگانا ہو وہ بھی اخبار نویس

بن جائے۔ آخر صحافت میں رکھا کیا ہے۔ اپنی دُکان چمکانے کے لئے ہندو مسلمان میں فساد کون کراتا ہے؟ اخبارات! آزادی کی تانیں اُڑا اُڑا کر در پردہ حکام کی چوکھٹ پر سجدے کون کرتا ہے؟ اخبارات! عوام کو ایثار اور اشتراکیت کی تعلیم دے دے کر مزدوروں کا خون کون چوستا ہے؟ اخبارات!

آپ اپنی مثال لے لیجئے۔ آپ کو صحافت سے کیا فائدہ پہنچا؟ اُلو کی طرح رات کو جاگنے اور دن کو سونے سے صحت آپ کی خراب ہو رہی ہے۔ تنخواہ کبھی وقت پر آپ کو نہیں ملی، تنگ دستی اور مالک کی ناروا سختیوں کا رونا ہر وقت آپ روتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دوسروں کو یہ تنور جھونکنے کی دعوت کیوں کر دیتے ہیں میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر زندگی علم کی نشرو اشاعت میں گزر جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ مقصدِ حیات پورا ہو گیا۔ جو شخص جہالت کی تاریکی رفع کرنے کے لئے علم کا چراغ روشن کرتا ہے اور نوعِ انسان کو ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے لئے علم کی مشعل بلند کرتا ہے۔ وہی سب سے پہلے جنت میں داخل ہو گا۔ یہ مقدس اور اہم ترین فرض صرف مدرس ادا کر سکتا ہے۔ ایک مدرس ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ اُس کا دماغ کبھی زنگ آلود نہیں ہوتا۔ اُس کے جذبات خوش رنگ و خوشبو دار پھولوں کی طرح ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔"

سلسلۂ کلام جاری ہی ہوتا ہے کہ کوئی شخص پکار اُٹھتا ہے۔ "بدر صاحب کیا خوب! مولانا غنیمت ایسے ہی مدارس کے متعلق تو فرما گئے ہیں۔

باامیدِ تماشائے لگارے نمودم جانبِ مکتب گزارے
برآمد بر درِ مکتب خروشم کہ من سیپارۂ دل می فروشم"

مجلس کی فضا ایک دم قہقہوں سے گونج اُٹھتی ہے۔ ہوٹل کا مہتمم جو برابر کے کمرے میں بیٹھا دن بھر کی آمد و خرچ کا حساب کر رہا ہے چونک کر دروازے میں سے جھانکتا ہے اور زیر خند ہو کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔

چند روز سے ہم ایک نو وارد کو ہوٹل میں دیکھ رہے تھے جو دونوں وقت یہاں کھانا کھاتا تھا۔ یہ شخص وضع قطع سے بہت بڑا رئیس معلوم ہوتا تھا۔ قد و قامت اور وجاہت میں بھی بہت نمایاں تھا۔ چہرے سے ذکاوت کے آثار ٹپکتے تھے لباس بہت شاندار اور قیمتی تھا۔ ایک ملازم مؤدبانہ طریقے سے ہر وقت اُس کے ہمراہ رہتا تھا۔ ہوٹل میں اُس کے لئے کھانا خاص تکلّف سے تیار کیا جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں سے ہم اتنا معلوم کر سکے کہ یہ کسی ریاست کا معزز عہدیدار ہے جو سرکاری کام کے لئے یہاں آیا ہے۔ ڈاکٹر یزدانی کی اِس سے علیک سلیک شروع ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر یزدانی مسلسل دو دن ہماری محفل سے غیر حاضر رہے۔ جب تیسرے روز آئے تو بہت خوش خوش دکھائی دیتے تھے۔ غیر حاضری کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے کچھ بہانہ سا بنا کر ٹال دیا۔ اب جمالی، رسوا اور ریدر تینوں یکے بعد دیگرے غائب رہنے لگے۔ شام کی مجلس بہت بے رونق ہو گئی تھی چند روز تو یہ حالت رہی کہ ہوٹل میں بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب دوبارہ گھما گھمی

شروع ہوئی تو ارکانِ محفل میں پہلی سی دلجمعی اور فراغت نظر نہ آتی تھی۔ رسوا تو اکثر یہ کہتے سنا گیا تھا "لاہور میں رہنے کو میرا اب جی نہیں چاہتا۔ مجھے تو جب کہیں باہر جانے کا موقع ملا میں فوراً چلا جاؤں گا۔"

ڈاکٹر یزدانی شک و شبہ سے رسوا کی طرف دیکھتے اور کہتے "ہاں بھائی سچ ہے لاہور کی آب و ہوا واقعی اچھی نہیں۔ یہاں کی فضا ہی ایسی ہے کہ کوئی شخص تندرست نہیں رہ سکتا۔ ایک لائق سے لائق طبیب یہاں بے بس ہو جاتا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اپنا مطب کسی اور شہر میں لے جاؤں۔"

جمالی اور بدر چپ رہتے اور کبھی کبھی یوں ہی بات کرنے کی خاطر کہہ دیتے تھے۔ "آب و دانہ کا اختیار ہے۔ دیکھئے قسمت میں کس کس جگہہ کا پانی لکھا ہے۔"

پندرہ بیس دن گزر گئے تو سب دوستوں میں گھبراہٹ اور اضطراب کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے لیکن کوئی شخص اس گھبراہٹ کا اظہار اپنی زبان سے نہ کرتا تھا۔ ایک دن علی الصبح ڈاکٹر یزدانی میرے پاس آئے اور کہنے لگے "مجھے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔"

میں نے کہا "فرمائیے۔ میں حاضر ہوں۔"

یزدانی نے کہا "آپ کو یاد ہو گا پچھلے دنوں ریاست چاگام کے ایک افسر یہاں آئے تھے میرے ساتھ ان کا ایک معاملہ طے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ مہاراجہ

ہومیوپیتھک علاج کے بہت معتقد ہیں اس لئے انہیں ریاست کے لئے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر درکار ہے۔ مجھ کو انہوں نے منتخب کیا تھا اور تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ مجھ سے ایک درخواست لکھا کر وہ اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ اور کہہ گئے تھے کہ باقاعدہ تقرّر سے پہلے والئی ریاست کی رسمی منظوری درکار ہے۔ درخواست کے ساتھ مجھ سے انہوں نے ایک سو روپیہ بھی وصول کیا تھا کہتے تھے کہ محض ضابطے کی پابندی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے اور اس بات کا انہوں نے یقین دلایا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر مجھے ریاست میں طلب کر لیا جائے گا۔ آج تین ہفتے گزر چکے ہیں وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔"

ڈاکٹر یزدانی نے بات ختم ہی کی تھی کہ بدرالحسن آ گئے اور انہوں نے اپنے متعلق من وعن وہی قصہ سنایا جو یزدانی سنا چکے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ بدرالحسن سے ریاست کے اسکول کی ہیڈ ماسٹری کا وعدہ کیا گیا تھا جس کی تنخواہ دو سو روپیہ تھی۔ اِن سے بھی درخواست کے ساتھ سو روپیہ وصول کیا گیا تھا۔ میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ تمام کارروائی فریب تھی۔ وہ شخص کوئی ٹھگ تھا کسی ریاست کا گماشتہ وماشتہ نہیں تھا۔ ہمیں دریافت کرنا چاہیئے کہ ہمارے دوستوں میں اور تو کسی سے یہ فریب نہیں ہوا۔"

شام کو رُسوا نے غمگین سی صورت بنا کر بتایا کہ اُس سے ریاست کے پبلسٹی افسر کے عہدے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی درخواست کے ہمراہ

سو روپیہ دے چکا تھا۔ یہی حشر جمالی کا ہوا۔ اُس کو چکمہ دیا گیا تھا کہ ریاست میں عنقریب ایک بیمہ کمپنی قائم ہونے والی ہے جس کا اُسے مینجر بنایا جائے گا۔

اِس واقعے کے بعد کئی روز تک اِس بات پر سرگرمی سے بحث ہوتی رہی کہ پولیس میں اطلاع کی جائے یا خاموش رہا جائے۔ آخر کثرتِ آراء سے فیصلہ ہوا کہ اس معاملے کو دبا دینا ہی بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُلٹا لینے کے دینے پڑ جائیں۔

قدرت کی گود میں

بقية الكتابة

قُدرت کی گود میں

آج وہ خلافِ معمول سرِ شام ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا، تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ لارنس گارڈن میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک ہجوم تھا، رنگ رنگ کی ساڑھیاں، قسم قسم کے سُوٹ۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے شوخ بھڑکیلے لباس باغ کے نزہت افزا سبزہ زار کے ساتھ مل کر آنکھوں میں طراوت پیدا کر رہے تھے۔ پہاڑی پر چاروں طرف پھُول ہی پھول تھے۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی، سبک رفتار موٹریں زرق برق لباس والی سواریاں بٹھائے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ وہ ان تمام چیزوں کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کی برقی رَو اُس کے اعصاب میں داخل ہو ہو کر خون میں حرکت کی ایک نئی لہر پیدا کر رہی تھی اور زندگی کی بُجھتی ہوئی چنگاری پھر سے روشن ہو رہی تھی۔ بے فکرے نوجوان ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، تر و تازہ گھاس کے زمرّدیں فرش پر ٹہل رہے تھے۔ وہ ہنستے تو بلند بالا قہقہوں کی گونج ہوا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتی تھی۔ خوبصورت عورتیں پاس سے گذر جاتیں تو چہروں کی آرائش اور سنگار کی چمک دمک سے آنکھوں میں چکاچوند سی آ جاتی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ زندہ رہنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ طبیعت

کی جولانی اور دل کی شگفتگی کو ہاتھ سے نہ دینا بھی کتنا بڑا کام ہے اور زندگی کی جدوجہد میں ہمیشہ سربلند و گردن کشاں رہنا بھی کیسی کٹھن منزل ہے۔

وہ آج چھ مہینے کی مسلسل خانہ نشینی کے بعد پہلی مرتبہ گھر سے باہر آیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ ہر لمحہ فریبِ نشاط میں مبتلا رکھنے والی دنیا ہمیشہ کی طرح اب بھی جوان ہے۔ لوگ اُسی طرح زندگی کے تیز رُو دریا میں سے مسرّت و شادمانی کا آبِ حیات پینے میں مصروف ہیں اُس کے دل میں ایک نشتر سا چُبھا کہ وہ قبل از وقت اِن ہنگاموں سے کنارہ کشی اختیار کر رہا ہے۔ ابھی وہ بالکل نوجوان تھا۔ چھبیس سال بھی کوئی عمر ہے پھر وہ کیوں مضمحل و افسردہ انسان کی طرح زندگی کی گہما گہمی سے مُنہ موڑ رہا تھا۔ یہ کھانے پینے کے دن۔ یہ نا و نوش کا زمانہ۔ یہ عیش و مسرّت کی راتیں وہ ایک چھوٹے سے قفس نُما مکان میں بسر کر رہا تھا۔ جہاں تنہائی، مہینوں کی لگاتار و پیوستہ تنہائی، نے اُس کے دل و دماغ کو مفلوج بنا دیا تھا۔ وہ اُس پرندکی طرح جو ابھی ابھی پنجرے سے اُڑ کر باہر آیا ہو کبھی باغ کی ایک روش سے دوسری روش پر اور کبھی پھولوں کے ایک قطعے سے دوسرے قطعے میں جا نکلتا تھا۔ آزادی سے گھومنا، خود اعتمادی سے دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا، راہ گیروں کے ساتھ کھوے سے کھوا ٹکرا کر چلنا اُسے ایک عجیب و غریب کام معلوم ہوتا تھا۔ گویا اُسے پہلے اس کا کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ بجلی کی روشنی نے باغ کی خوبصورتی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا جگہ جگہ برقی قمقمے جگمگانے لگے تھے جن کی شعاعیں درختوں کی گنجان شاخوں میں سے چھن چھن کر زمین پر پڑتیں تو

سیاہی اور سفیدی کا جال بچھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ خوشبو سے لدی ہوئی ہوا کے جھونکے آ آ کر اُس کے دماغ کو معطّر کر رہے تھے۔ اُس کا دل مدّت سے جس بارِ غم کے نیچے دبا ہوا تھا اور جسے راتوں کی مسلسل بے خوابی اور دِنوں کی متصل بے آرامی نے بڑھا بڑھا کر اس قدر ہولناک بنا دیا تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی نے اپنی تمام نعمتوں کے دروازے اُس کے لئے بند کر دیئے ہیں آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوا۔ وہ باغ کے اُس گوشے میں کھڑا تھا جہاں سے منٹگمری ہال کی عالی شان عمارت اور اُس عمارت کے سامنے پھولوں سے بھرا ہوا میدان صاف نظر آ رہا تھا۔ چاند اپنی پوری تابانی سے چمک رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے نور کی بارش نے باغ کو ہر قسم کی آلائش سے پاک و صاف کر کے اس قدر پاکیزگی بخش دی ہے کہ اب اُس منزّہ و مطہر فضا میں رنج و مصیبت کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ یکایک اُس کی آنکھوں کے آگے سے گویا پردہ سا ہٹنے لگا اور اُس نے محسوس کیا کہ دنیا اپنی وسعت کے باوجود یقیناً اس قدر تنگ نہیں ہوئی کہ فرشِ زمین و سقفِ آسماں کے درمیان اُس کے لئے زندہ رہنے کی گنجائش بھی نہ نکل سکے۔

آج سے پندرہ سال پہلے نعیم کے والد کی ناگہانی موت نے اُس کی آئندہ پرورش کا تمام بوجھ اُس کی ماں کے نحیف و زار کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ نعیم کی عمر اُس وقت دس گیارہ برس کی ہو گی۔ رہنے کے ایک چھوٹے سے مکان کے علاوہ اور کوئی جائداد نہ تھی جو آئندہ بسرِ اوقات کی کفیل بنتی۔ اُس کی ماں نے نوشتۂ تقدیر کے سامنے

چُپ چاپ سر جھکا دیا اور دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے لختِ جگر کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہو گئی۔ وہ ایک حد درجہ شریف اور پاکباز خاتون تھی۔ محلّے بھر میں اُس کی نیکی اور دین داری کا چرچا رہتا تھا۔ لوگ اُس کے دُکھ درد میں شریک ہونے اور اُس کی موجودہ تکلیف کو کم کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لیکن وہ تن تنہا قسمت پر قانع، صبر و شکر کے ساتھ زمانے کی سختیاں برداشت کرنے پر آمادہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حالات سازگار نہیں ہیں اور مستقبل میں غالباً اس سے بھی بدتر واقعات پیش آنے کا امکان ہے۔ بایں ہمہ وہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کر کے اپنے مرحوم خاوند کی روح کو شرمسار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اُس کے اکلوتے بچے کے دل میں ابھی سے یہ خیال راسخ ہو جائے کہ وہ دوسروں کی خیرات پر اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ خودداری، غیرت اور عزتِ نفس۔ اُس کا مرحوم خاوند انہی تین صفات کا مجموعہ تھا۔ اُس نے افلاس اور غربت کے انتہائی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور جب اُس نے زندگی کے کارزار میں قدم رکھا تھا تو کس مپرسی اور بے کسی کے علاوہ کوئی پُرسانِ حال بھی نہ تھا۔ چند ہی سال میں کسی خارجی امداد پر بھروسہ کئے بغیر وہ زندگی کی جدوجہد میں اپنے ہم عصروں سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اگر اُس کی عُمر کا پیمانہ اتنی جلدی لبریز نہ ہو جاتا تو شاید وہ دنیا کو دکھاتا کہ محنت، جفاکشی اور صداقت پسندی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اُس نے جیتے جی اپنی بیوی کو ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ شہر کی امیر کبیر

عورتوں سے کسی حیثیت میں بھی کمتر ہے۔ ایک مختصر سے مکان میں جہاں گرد و پیش خوشحال لوگوں کی آبادی تھی اُن کا قیام تھا۔ اِسی مکان میں جب نعیم پیدا ہوا تو انہوں نے محسوس کیا کہ زندگی کے اُفق سے تاریکیاں ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہیں اور اب اُن کا مطلع حیات کبھی مکدّر نہیں ہوگا۔ لاڈ اور پیار میں پلے ہوئے بچے نے ابھی زندگی کی بہ مشکل دس بہاریں دیکھی تھیں کہ سر سے شفیق و مہربان باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ یہ حادثہ اتنا رنج دہ اور تباہ کُن تھا کہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید شدّتِ غم سے ہوش و حواس کھو بیٹھتی لیکن نعیم کی ماں نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ قدرت کے کاموں میں دخل دینا بے سُود ہے۔ اب ہر لمحہ اُس کی نظریں اپنے بیٹے کے مستقبل پر جمی رہتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی کہ نعیم پڑھ لکھ کر جوان ہوگا تو اُس کے سب فکر دُور ہو جائیں گے۔ پھر وہ کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائے گا تو اُس کی تمام مصیبتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ اُس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ جب تک نعیم تعلیم سے فارغ نہیں ہوتا وہ اپنے لئے آرام و راحت کے ہر قسم کے سامان کو حرام قرار دے لے گی محض جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روکھی سوکھی کھا کر گذارہ کرنا اور تن پوشی کے لئے گاڑھے کے معمولی سے کپڑے پہن لینا اُس نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ فرصت کا تمام وقت وہ محنت مزدوری میں صرف کرنے لگی تھی۔ محلّے کی اکثر لڑکیاں اُس سے پڑھنے آجاتی تھیں جن سے وہ حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ معاوضہ لے لیتی تھی۔ جاڑے کی لمبی راتوں میں وہ بیٹھی گرم موزے اور سویٹر بُنتی رہتی تھی گرمیوں کے پہاڑ سے دن

وہ مشین پر کپڑے سی سی کر گذار دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نعیم کا دل میلا نہ ہو اور وہ یہ محسوس نہ کرے کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے وہ زندگی کی اُن آسائشوں سے محروم ہے جو اُس کے ہمجولیوں کو حاصل ہیں۔ چنانچہ نعیم بھی جب تک اسکول میں پڑھتا رہا تنگدستی کے احساس سے ایک دن آشنا نہ ہوا تھا۔ دسویں جماعت پاس کرکے وہ کالج میں داخل ہوا تو اُس کی ماں کو مستقبل کی درخشانی کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے۔ اُس کے دل کو حوصلہ ہو گیا تھا کہ زندگی کی کٹھن منزل آہستہ آہستہ طے ہو رہی ہے اور اب چند سال کی بات ہے کہ اُس کے خواب کی تعبیر سامنے آجائے گی۔

نعیم کالج میں داخل ہوا تو اُسے اپنی ماں کی قربانیوں کا احساس ہوا۔ اب اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے آرام و آسائش کے ایک ایک لمحے کی قیمت اُس کی ماں کی پوری ایک ایک رات کی بے خوابی اور پورے ایک ایک دن کی مشقت تھی۔ اُس نے دیکھا کہ عیش و آرام کی جن چیزوں کو وہ اپنا حق سمجھ کر طلب کیا کرتا تھا حقیقتاً اُن کے حاصل کرنے میں اُس کی ماں کو خونِ جگر بہانا پڑتا تھا۔ اس احساس کے رُونما ہوتے ہی نعیم کے دل میں اپنی ماں کے لئے تشکر و امتنان کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی اُس کے قلب و دماغ پر ایک ایسی الم انگیز رقت طاری ہوئی کہ وہ بے اختیار چاہتا تھا کہ اپنا سر اپنی ماں کے قدموں پر رکھ دے اور اس شدت کے ساتھ روئے کہ آنسوؤں کی روانی میں اُس کے دل کا بخار تحلیل ہو کر بہہ جائے۔ جوں جوں دن گذرتے گئے اُس کی یہ کیفیت پختہ ہوتی

گئی۔ اُسے معلوم ہوا کہ جب اُس کا باپ دنیا سے رخصت ہوا تھا تو گھر میں بمشکل سے اتنی رقم تھی کہ سال بھر کا گذارہ ہو سکتا تھا۔ اِن نامساعد حالات میں تنہا اُس کی ماں تھی جس کی ہمت اور جس کے استقلال نے گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا تھا۔ یہ صرف اُس کی ماں کا وجود تھا جس نے پوری قوت کے ساتھ آندھیوں کا مقابلہ کیا اور اپنے نورِ نظر پر آنچ تک نہ آنے دی نعیم نے اپنی ماں کے احسانات کے سامنے، جن سے اُس کا رُواں رُواں بندھا ہُوا تھا، جب اپنی عاجزی اور بے بضاعتی کو دیکھا تو اُس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور پھر اُس نے اندر ہی اندر رنج و غم کے گھونٹ پی کر قسم کھائی کہ اب اُس کی زندگی کا واحد مقصد یہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ اپنے آپ کو ایک لائق فرزند بنائے تاکہ اپنی ماں کی خدمت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔

صبح و شام یہ مقصد ستارے کی طرح اُس کے سامنے روشن رہنے لگا تھا اسی مقصد کی رہنمائی میں اُس نے دنیاوی کشمکش میں اپنا رستہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور اسی مقصد کی روشنی میں اُس نے اپنے طرزِ بود و ماند کا نئے سرے سے جائزہ لیا تاکہ یہ دیکھ سکے کہ اُس کے اعمال مجوّزہ نصب العین تک پہنچنے کی کفالت کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ ہر بات سے اپنی ماں کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں تھا اور ہر فعل سے اپنی ماں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ اُس میں اپنے مرحوم باپ کا صحیح جانشین بننے کی صلاحیتیں ہیں۔ چنانچہ اِس دُھن میں اُس نے پورے انہماک کے ساتھ اپنے

درسی مشاغل میں حصہ لینا شروع کیا یوں تو وہ پہلے بھی پڑھنے لکھنے سے کبھی غافل نہیں ہوا تھا لیکن اب اُس کے عزم آہنیں نے ایک نئی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ اپنی تمام کوششیں حصولِ علم کے لئے وقف کر دے اگر اُس کی محنت بار آور ہوئی اور وہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر کسی مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً اُسے کوئی اعلیٰ عہدہ مل جائے گا۔ اس طرح گویا ماضی کی ساری کلفتوں کے داغ دُھل جائیں گے اور وہ اپنی ماں کی قربانیوں کا بخوبی اجر دے سکے گا۔

نعیم نے کالج میں اپنی نیک نامی اور قابلیت کا سکّہ بٹھا دیا تھا۔ اُس کی ماں جب لوگوں کی زبانی اپنے ہونہار بیٹے کی تعریفیں سنتی تو اُس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگتا تھا۔ وہ حسرت بھری آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتی اور دل ہی دل میں دُعا کرتی کہ اُس کا لختِ جگر نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ جاڑوں کے موسم میں نعیم رات کے بارہ بارہ بجے تک مطالعہ میں محو رہتا تھا اور اُس کی ماں پاس بیٹھی آنکھ تک نہ جھپکتی تھی۔ نعیم بہتیرا منع کرتا لیکن اُس ماملتا کی ماری کو یہ کیونکر گوارا تھا کہ اُس کے جگر کا ٹکڑا تو کڑکڑاتی سردی میں جاگ جاگ کر راتیں بسر کرے اور وہ نرم و گرم بستر میں غافل سوتی رہے جب نعیم کا اصرار حد سے بڑھنے لگتا تو وہ غم خواری کے انداز میں مسکرا دیتی اور چپکے سے اُون اور سلائیاں اُٹھا کر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر سوئیٹر اور موزے بُننے میں مصروف ہو جاتی تھی۔

نعیمؔ نے ایف اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی یعنی کالج بھر میں دوسرے نمبر پر آیا۔ اب اُس کی شہرت محلّے کے محدود حلقے سے نکل کر شہر کے دوسرے گھرانوں تک بھی پہنچنے لگی تھی جو براہِ راست اُس سے واقف نہ تھے۔ دل و دماغ کی قابلیت کے ساتھ قدرت نے اُس کو شکل و صورت بھی ایسی عطا کی تھی کہ وہ حُسنِ ظاہر و حُسنِ باطن کا ایک قابلِ رشک نمونہ بن گیا تھا۔ اگرچہ لباس کے معاملے میں وہ زیادہ محتاط نہ تھا اور نہ ہی اُسے بنے ٹھنے رہنے کا چنداں شوق تھا لیکن صاف ستھرے کپڑوں میں اُس کا مضبوط سڈول جسم عنفوانِ شباب کی دلفریبیوں کا ایک صحیح مرقع نظر آتا تھا۔ بی اے کے دو سال اُس کو بڑی سرگرمی اور محنت سے بسر کرنا پڑے۔ مالی پریشانیاں ان دو برسوں میں پہلے سے دُگنی ہو گئی تھیں۔ اس لئے نعیمؔ کو مجبوراً کچھ فرصت کا وقت نکال کر ٹیوشن سے روپیہ کمانا پڑا۔ بہر حال اُس نے بی اے میں اچھے نمبر پائے۔ اگرچہ اُس نے کوشش بہی کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح درجۂ اوّل حاصل کرے لیکن ان مجبوریوں کے باعث وہ یہ اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

بی اے بعد وہ اپنے پروفیسروں کے مشورے سے ایم اے میں داخل ہو گیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ ایم اے کے ساتھ ساتھ وہ مقابلے کے کسی امتحان میں شامل ہونے کی بھی سر توڑ کوشش کرے گا۔ اُسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اِسی ایک چیز پر گویا اُس کے مستقبل کی ساری بہبود کا انحصار ہے۔ اس دوران میں

اُسے متعدد جگہوں سے ٹیوشن کی درخواستیں آئیں لیکن اُس نے اُن پر کوئی غور نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بہت بڑے رئیس کے بیٹے کو پڑھانے کا کام مل جائے تو زیادہ مفید ہوگا۔ اس طرح وہ ایک ہی جگہ سے معقول تنخواہ پا لے گا اور مختلف لڑکوں کے ساتھ دماغ سوزی کی زحمت سے بچ جائے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انہی دنوں شہر کے ایک چوٹی کے معزز اور متمول گھرانے سے اُسے ٹیوشن کا پیغام آیا۔ نعیم کو اس دعوت کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ تھا۔ لیکن صرف ایک چیز ایسی تھی جس نے اُس کو اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بار بار سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پڑھنے والا لڑکا نہیں تھا بلکہ لڑکی تھی۔ اتنے بڑے خاندان کی پردہ نشین لڑکی کو پڑھانے کے لئے نعیم کو روزانہ اُن کے مکان پر جانا ہوگا۔ چنانچہ نعیم پورا ایک ہفتہ اِسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا کہ اس دعوت کو منظور کرے یا رد کر دے۔ لڑکی گھر پر ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ اور اُسے ہر روز شام کو دو گھنٹے کے لئے ٹیوٹر کی امداد کی ضرورت تھی۔ نعیم نے اپنی والدہ سے ذکر کیا تو اُس نے بھی کچھ ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ مشاہرہ ساٹھ روپے ہے۔ آخر ماں بیٹے کی یہی صلاح ٹھہری کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہئیے۔

نعیم نے اب باقاعدہ ہر شام اپنے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اُس کی شاگرد کا نام فردوس تھا اور عمر بیس اکیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اِس گھرانے میں قدامت پسندی کی وجہ سے اوّل تو عورتوں میں تعلیم جدید کا رواج ہی کم تھا اور پھر لڑکیوں کو تعلیم دینے

کا خیال آیا بھی تو فردوس کے والد نے فردوس کو میٹرک کے بعد کالج میں بھیجنا گوارا نہ کیا۔ فردوس کو آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا بے حد شوق تھا اس لئے اُس کی والدہ کے اصرار پر فردوس کے باپ نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ اُس کے لئے ایک اُستاد رکھ دیا جائے جو گھر میں آکر پڑھا جایا کرے۔ فردوس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں تموّل، بے فکری، فراغت اور عیش و تنعم کا دور دورہ تھا۔ بہتر سے بہتر کھانا اور اچھے سے اچھا پہننا اُس کا روزمرّہ کا معمول بن گیا تھا۔ گھر کی چار دیواری میں اُسے بظاہر تفریح کے سبھی سامان میسّر تھے اور پھر چونکہ کنبے بھر میں وہی ایک لڑکی تھی جس نے میٹرک کے بعد کالج کی تعلیم میں بھی قدم رکھا تھا اس لئے گھر کے تمام لوگوں پر اُس کا ایک خاص قسم کا تفوق سا قائم ہو گیا تھا۔ اُسے ایک علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا جسے اُس نے اپنے ذوق کے مطابق بیش قیمت اور خوبصورت سامان سے سجا رکھا تھا۔ اُسے ہر ماہ جیب خرچ کے لئے کافی رقم ملتی تھی جسے وہ اپنی خواہش کے مطابق جس طرح چاہے صرف کر سکتی تھی۔ اُسے شعر و سخن کے علاوہ موسیقی اور مصوّری کا بھی کچھ شوق تھا۔ اسکول کے زمانے میں اُس نے ماں باپ سے چوری ایک سہیلی کی مدد سے شہر کے مشہور فوٹوگرافر سے اپنی تصویر بھی کھچوائی تھی۔ اس تصویر کی دو کاپیاں اُس نے اپنی دو سہیلیوں کو دے دی تھیں اور ایک کاپی اُس کے پاس موجود تھی جسے وہ بہت احتیاط سے چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ اُس نے اپنے البم میں مشہور مقامات کے علاوہ خوبصورت ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی بہت سی تصویریں

جمع کر رکھی تھیں۔

فردوس کا قد لمبا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ اُس کی رنگت میں تھوڑا سا سانولا پن تھا۔ لیکن چہرے کے نقش بے حد دلکش تھے۔ سیدھی ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ اور لمبی لمبی نشہ ریز آنکھیں تھیں جن پر گھنی پلکیں اِس طرح جُھکی رہتی تھیں گویا کسی جھیل کے صاف و شفاف پانی پر بیدِ مجنوں کی شاخوں نے سایہ کر رکھا ہو۔ اُس کے رُخسار جوانی کی حدت سے ہر وقت تمتمائے رہتے تھے اور نیچے کا ہونٹ دُور سے ایک طرف کو ذرا خم کھایا ہوا معلوم ہوتا تھا جس سے دیکھنے والے کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے چہرے پر ہمیشہ ایک شرارت آمیز تبسم کھیلتا رہتا ہے۔ فردوس دن میں کئی مرتبہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو ہو کر، پہلو بدل بدل کر، اپنے جسم کا۔ اپنی چال ڈھال کا۔ اپنے لباس کی پھبن کا جائزہ لیتی رہتی تھی۔ اُس کی سنگار میز اعلیٰ درجے کی ولائتی خوشبوؤں، غازوں اور ابٹنوں سے پٹی پڑی تھی جنہیں وہ ایک صنّاع کی سی ہُنر مندی کے ساتھ استعمال کرنا جانتی تھی۔ وہ بالعموم دِن میں دو مرتبہ لباس تبدیل کرنے کی عادی تھی۔ اُس کے کپڑوں کی الماری رنگ رنگ کی ساڑھیوں، قسم قسم کے ریشمی دوپٹوں اور بہترین درزی کے ہاتھ کے سلے ہوئے لباس ہائے فاخرہ سے بھری رہتی تھی۔ وہ جونہی الماری کا دروازہ کھولتی عطرِ حنا کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک اُٹھتا تھا۔ فردوس کے والد کا مکان جسے وُسعت و عظمت کے اعتبار سے ایک محل کہنا کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا چاروں طرف اُونچی اُونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ بیرونی دنیا کے شور و غوغا کا اُن بلند بالا،

عفریت نما، سنگین دیواروں کو چیر کر اندر آنا محال تھا۔ فردوس ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کر رہی تھی جہاں اُس کا تموّل، اُس کا شباب اور اُس کے ارمان اپنے اظہار کا کوئی حیات افروز وسیلہ نہ پا کر چُپ چاپ اُس سمندر کی سی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے جس کی سطح کے نیچے شورش و اضطراب کا ایک محشر بپا ہو اور اوپر سکون چھایا ہُوا ہو۔ کبھی کوئی سہیلی اُس سے ملنے آجاتی یا کبھی کبھی وہ اپنی ماں کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر باہر جاتی تھی تو اُسے زندگی میں تنوّع کا احساس ہوتا تھا۔ مال پر سے گذرتے ہوئے یا جب انار کلی کی بے پناہ بھیڑ میں سے شوفر ہارن بجا بجا کر بڑی مشکل سے راستہ پیدا کرتا تو وہ برقعے لپٹی لپٹائی موٹر کی کھڑکیوں میں سے جھانک کر اس گہما گہمی کو دیکھتی تھی جہاں فرزندانِ آدم ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر، جسم سے جسم چھُوا کر چلتے تھے۔ اس ہجوم کو دیکھتے ہی اُس کے اندر زندگی کی چنگاری بڑی شدّت سے بھڑک اُٹھتی تھی۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ تنہا آئینے کے سامنے کھڑی اپنے قامت کی رعنائی، اپنے لباس کی موزونی اور اپنے چہرے کی دلکشی کو دیکھ دیکھ کر غمگین سی ہو جاتی تھی۔ اُس کے دل میں بے نام سی خواہشیں سر اُٹھانے لگتیں اور وہ اُن کے مقابلے کی تاب لاتے ہوئے گھبرا کر ایک طرف کو سرک جاتی تھی۔ ایسے لمحوں میں، جن سے اب قریب قریب اُسے ہر روز دوچار ہونا پڑتا تھا، وہ بے اختیار چاہتی تھی کہ کوئی رفیق اُس کے پاس ہو جس کے سامنے وہ رو رو کر اپنے دل کی کیفیت بیان کرے۔ اُس کی روح چاہنے اور چاہے جانے کے لئے بے قرار تھی۔ ایک سال ہوا کہ گھر میں اُس کی شادی کا کچھ چرچا ہُوا تھا لیکن اب

مدت سے اس موضوع پر کوئی بات سننے میں نہ آئی تھی۔ اُس کے مغرور و متموّل والدین کی نگاہ میں کوئی شخص جچتا ہی نہ تھا۔ فردوس کو یہ اندیشہ ہر وقت مضطرب اور پریشان رکھنے لگا تھا کہ شاید اب اس کے لئے کہیں سے پیغام آئے گا ہی نہیں کبھی کبھی وہ اِس رُوحانی اضمحلال سے تھکی، ہاری، شکستہ، مغموم، اپنے مکلّف و مطلا اور نرم و گداز بستر پر لیٹے۔ آنکھیں چھت کی طرف جمائے۔ ایک خیالی محبوب کی پذیرائی کے خواب دیکھا کرتی تھی جو یکایک اُس کی زندگی کے اُفق سے نمودار ہو گا اور اپنی سحر کار نگاہوں سے ایک ہی وار میں اُس سے صبر و قرار کی دولت چھین کر لے جائے گا۔

نعیم جب اُس کو پڑھانے کے لئے پہلے روز آیا تو اُس کو دیکھ کر فردوس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بیس بائیس سال کا ایک حسین و تنومند نوجوان۔ تہذیب و شائستگی کا مجسّمہ۔ علم و ادب کا پیکر اور شرم و حیا کا نمونہ۔ یہ تھا وہ اتالیق جس کی معیّت میں فردوس کو اپنا تعلیمی سفر پورا کرنا تھا۔ نعیم کی یہ حالت تھی کہ آنکھیں کتاب کے صفحے سے اُوپر اُٹھتی ہی نہ تھیں۔ بات بھی کرتا تھا تو ٹھہر ٹھہر کر، الفاظ تھے کہ رُک رُک کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُس کے مُنہ سے نکلتے تھے۔ فردوس خود حد درجہ ادب اور تمیز کے ساتھ کچھ فاصلے پر بیٹھی کنکھیوں سے یہ کیفیت دیکھ رہی تھی نعیم بولتا تو فردوس کو یوں معلوم ہوتا تھا گویا دُور سے نقرئی گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آ رہی ہے نعیم پڑھا کر چلا گیا تو فردوس کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگی اُس کے دل کو اطمینان سا ہو گیا تھا کہ کچھ بھی ہو اب تنہائی ویسی الم انگیز زندگی ویسی بے کیف اور صبح و شام کا تسلسل ویسا بے آب و رنگ نہیں ہو گا۔

ایک مہینہ تو یہ معمول رہا کہ جب تک فردوس نعیم سے پڑھ کر فارغ نہ ہو جاتی۔ فردوس کی ماں خود اُن کے پاس موجود رہتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کو یہ پابندی گراں گذرنے لگی اور اُس نے خود ہی وہاں بیٹھنا ترک کر دیا۔ یوں ہی کبھی کبھی جھانک کر اندر دیکھ لیا کرتی تھی کچھ عرصے کے بعد یہ جھانک کر دیکھنا بھی چھوٹ گیا۔ اب نعیم اور فردوس میں کسی قدر بے تکلفی ہو گئی تھی۔ دونوں ایک ہی میز پر کتابیں رکھ کر پڑھتے تھے۔ کرسیاں بھی دونوں کی بالکل ایک دوسرے کے متصل ہوتی تھیں۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ ایک اُستاد اور دوسری شاگرد۔ اُستاد نوجوان ہونے کے باوجود مصائب کا زخم خوردہ اور زندگی کی تلخ کامیوں کا شکار۔ اور شاگرد حُسن و شباب کی تمام رعنائیوں سے مرصّع ہونے کے ساتھ ساتھ ناز و نعمت کی پروردہ اور زندگی کے روشن پہلو سے لُطف اندوز۔ نعیم کو اپنے فرائض کا بہت احساس تھا اور وہ دو گھنٹے ختم ہوتے ہی وہاں سے رخصت ہو جاتا تھا۔ فردوس کبھی کبھی اُسے باتوں میں لگا کر روک لینے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ وہ نعیم کے خاندانی حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی اور اب وہ اکثر اُس سے ذاتی معاملات کے متعلق سوال کیا کرتی تھی جن کا جواب دینے کی بجائے نعیم ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیتا تھا۔ فردوس نے ایک روز جرأت کر کے اپنی تصویر نعیم کو پیش کر دی۔ نعیم نے تصویر تو اُٹھا لی لیکن اُس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے اور چہرے کا رنگ جذبات کی شورش سے بالکل بدل گیا تھا۔ اُس نے تصویر کو بڑی احتیاط سے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور اُٹھ کر چلا آیا۔ گھر آ کر اُس نے دیکھا کہ تصو

کی پُشت پر فردوس کے ہاتھ سے ایک فارسی شعر لکھا تھا جس کا مطلب تھا کہ "میرے محبوب، یہ تصویر کا تحفہ قبول کر تاکہ میری آنکھیں ہمیشہ تیری دید سے تسکین حاصل کرتی رہیں"۔

نعیم دیر تک مختلف خیالات میں محو تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہی لمبی لمبی گھنی پلکوں سے ڈھنکی ہوئی مے گسار آنکھیں، وہی گلاب کی پنکھڑی جیسے نرم و نازک ہونٹ جن پر ایک پُراسرار تبسم رقص کرتا معلوم ہوتا تھا۔ وہی جوشِ جوانی سے تمتمائے ہوئے رخسار جن کو نعیم ہر روز للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن آج اِس تصویر کو دیکھ کر نعیم کو فردوس کے نقش و نگار میں نئی نئی نزاکتیں، نئی نئی لطافتیں اور نئی نئی قیامتیں نظر آئیں۔ فردوس نے بہترین ساڑھی پہن رکھی تھی اور فوٹوگرافر کی چابکدستی نے اُس کی لمبی عریاں گردن میں، جس کی زہد شکن برہنگی دور تک پھیلتی چلی گئی تھی، ایک ایسا دلآویز خم پیدا کر دیا تھا کہ یہی معلوم ہوتا تھا گویا ایک شراب سے بھری ہوئی صراحی ہے جس میں سے بادۂ تند ابھی ابھی اُبل کر بہنا شروع ہو جائے گا۔

نعیم رات بھر جاگتا رہا۔ اُس نے سو جانے کی بہتیری کوشش کی لیکن اُس کے جذبات میں ایک ایسا طوفان جاری تھا کہ بمشکل پانچ منٹ کے لئے آنکھ لگتی بھی تھی تو دل اِس زور سے دھڑکنے لگتا کہ وہ بے اختیار آنکھیں کھول دیتا تھا۔ فردوس کی تصویر اُس کے بستر کے تکئے کے نیچے رکھی تھی۔ وہ کئی مرتبہ اُس کو چوم چوم کر اپنی دیوانگی کم کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اب پھر اُس نے تکیہ اُٹھایا اور بجلی کی روشنی میں دیر تک تصویر کو

دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اِس بے تابی کے ساتھ گویا اُس پر جنون کا دورہ ہُوا ہے اُس نے تصویر کو بار بار چومنا شروع کیا اور جب تسکین نہ ہوئی تو اُس کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

نعیم اور فردوس کے درمیان باقاعدہ تعلقاتِ محبت قائم ہو گئے تھے اور اب ہر روز اُن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُستادی شاگردی نے بڑھتے بڑھتے عشق و عاشقی کی صورت اختیار کر لی تھی اور درس و تدریس کے دو گھنٹے آنکھ جھپکنے میں گذر جاتے تھے۔ فردوس کس شدت سے چاہتی تھی کہ نعیم کو اپنے سے جدا نہ ہونے دے۔ وہ چلا جاتا تو دنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیر ہو جاتی تھی۔ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے وہ عالمِ خیال میں اُس سے باتیں کیا کرتی تھی۔ شام کو اُس کے آنے سے کچھ پہلے وہ بن سنور کر یوں اُس کی منتظر رہتی تھی گویا ایک نئی نویلی دُلہن اپنے محبوب کے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ اچھے کپڑے پہننے کا تو اُسے شروع سے شوق تھا لیکن اب اُس نے بڑی کاوش سے اپنے لئے نفیس ترین لباس تیار کرائے تھے۔ ان حسین و جمیل ملبوسات میں غرق، اعلیٰ درجے کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی، چہرے کو غازہ و گلگونہ سے اِس قدر مجلّا کئے کہ آنکھیں چندھیا جائیں وہ نعیم کے لئے آغوشِ شوق وا کئے بیٹھی رہتی تھی نعیم آتا تو گویا شبِ تاریک میں قندیلِ مہتاب روشن ہو جاتی تھی۔ میز پر کتابیں کھول کر قریب قریب کرسیاں بچھا کر وہ ہم آغوشیوں میں یوں بے خود و مدہوش ہو جاتے تھے کہ شاید اب اِس خوابِ شیریں سے کبھی بیدار

بیدار نہ ہوں گے۔ کبھی کبھی یکلخت، ایک اضطراری جنبش کے ساتھ نعیم گھبرا کر اُس سے الگ ہو جاتا تھا تو وہ اپنی لمبی لمبی پلکیں اُٹھا کر، نیم وا آنکھوں کو اور زیادہ کشادہ کر کے حیرت و استعجاب کے ساتھ اُس کو دیکھتی تھی کہ ایسی سرور انگیز ساعتوں کو اپنے ہاتھ سے کیوں ضائع کر رہا ہے۔ نعیم کے دل میں ایک چور تھا جو اُسے کسی گھڑی چین لینے نہیں دیتا تھا۔ یہ خیال کہ وہ راہِ راست سے بھٹک گیا ہے اُس کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ جس مضبوط چٹان پر وہ جم کر بیٹھا ہوا تھا وہ ریت کے قلعے کی طرح مسمار ہو رہی ہے۔ آندھی کا ایک ریلا اور آیا تو وہ کسی عمیق غار میں اس طرح اوندھے مُنہ گرے گا کہ شاید زندہ بھی نہ بچ سکے۔ اُس کی بیوہ ماں جسے مستقبل کی کامیابیاں اپنے سامنے یوں سر اٹھائے نظر آ رہی تھیں جس طرح مطلع صاف ہو تو دُور سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دھوپ میں چمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے بیٹے کے لئے دن رات دعاؤں میں مصروف رہتی تھی۔ نعیم اپنی ماں کے غم زدہ اور متفکّر چہرے کو دیکھتا تو اُس کے دل میں درد سے ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رات کی تنہائی میں اپنے کمرے کے کواڑ بند کر کے اُس نے بے اختیار آنسو بہائے اور رو رو کر دعا مانگی کہ خدا اُسے اِس ابتلا سے نجات دے۔ کئی مرتبہ اُس نے تہیّہ کیا کہ وہ ٹیوشن چھوڑ دے گا اور کئی دفعہ تو وہ اِس عزمِ مصمّم کے ساتھ اپنے گھر سے نکلا بھی تھا کہ جاتے ہی فردوس کے والد سے کہہ دے کہ وہ آئندہ اُن کی بیٹی کو پڑھانے سے معذور ہے لیکن کسی مقناطیسی کشش سے اُس کے قدم سیدھے اُس کو فردوس کے کمرے میں

پہنچا دیتے تھے، جس کی فضا حجلۂ عروسی کی طرح معطّر و منوّر تھی اور جہاں دُلہن کی طرح سجی سجائی فردوس بہ ہزار ناز و رعنائی اُسے دعوتِ نشاط دینے کو موجود تھی اِس فضا میں سانس لیتے ہی وہ سب ارادے بھول جاتا تھا اور پھر ایک بھوکے اور حریص انسان کی طرح وہ حُسن و عشق کی لذّتوں سے پوری طرح متمتّع ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

ایک روز فردوس نے اُس کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر اُنہی کے ہاں آجائے۔ اس طرح یکجائی ہو جائے گی اور اُنہیں آپس میں ملاقات کے موقعے شب و روز ملتے رہیں گے۔ نعیم اس تجویز کو کسی صورت بھی منظور کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اُس کے دل میں اپنی ماں کا اب بھی اتنا خوف اور احترام تھا کہ وہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ ایک ہی شہر میں رہ کر اُس سے علیحدہ کسی اور مکان میں زندگی بسر کرے۔ وہ ہر لمحہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کے اطوار بگڑتے جا رہے ہیں لیکن اُسے یقین تھا کہ یہ سارا ہنگامہ ایک سراسر عارضی دلبستگی ہے۔ وہ جب چاہے گا طرفۃ العین میں ایک جھٹکے سے اِن زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائے گا۔ کتنی دفعہ اُس نے ٹٹول ٹٹول کر اپنے دِل کا جائزہ لیا کہ دیکھے کہ فردوس کی محبت کن گہرائیوں تک اتر گئی ہے۔ لیکن اُس نے تفحص و تجسّس کے بعد ہر بار یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اُسے فردوس سے ایسا تعلقِ خاطر نہیں ہے کہ محض اُس کی خاطر اپنی زندگی خراب کر لے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے جوانی کا فریب ہے اور وہ جلد ہی اس خواب سے بیدار ہو کر اُس مقصد کے حصول

کی جد و جہد میں مصروف ہو جائے گا جو آج تک زندگی کے طوفانی حادثوں میں روشنی کے بلند مینار کی طرح اُس کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔

اِدھر نعیم خیالات کی اس بھول بھلیاں میں گھوم رہا تھا۔ اُدھر غیر شعوری طور پر فردوس کی محبت اُس کے گرد ایک ایسا باریک جال تن رہی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود بھی اُس کے تاروں سے رہائی نہ پا سکے۔ وہ ارادے باندھ کر توڑتا اور روشنی کا مینار دیکھ دیکھ کر بھٹک رہا تھا۔ مسلسل ارادے باندھنے اور پھر اُن کو توڑ دینے سے وہ اپنے نفس کو پیہم فریب دینے کا عادی ہو گیا تھا۔ آخر اُس کی ماں نے محسوس کر لیا کہ اس کے بیٹے میں تغیر آ رہا ہے اور ایک روز بہت تامل کے بعد اُس نے باتوں باتوں میں اس حقیقت کا اظہار بھی کر دیا۔ نعیم کی تو یہ حالت ہوئی گویا عین چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں اُس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے سلامتی کا یہی ایک راستہ باقی ہے کہ فردوس سے اپنا تعلق بالکل منقطع کر لے۔ وہ شام کو جب اُس کے ہاں گیا تو اُسے پختہ یقین تھا کہ آج دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ اُسے اپنی ماں کی زبان سے سرزنش کا خفیف سے خفیف لفظ سننے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ فردوس سے ہر قسم کی راہ و رسم بند کر کے وہ پوری تن دہی سے اپنے درسی مشاغل میں منہمک ہو جائے۔

معلوم نہیں فردوس نے اُس دن آرائشِ جمال میں کیوں اس قدر غیر معمولی

کاوش سے کام لیا تھا کہ اُس کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد متاعِ صبر و قرار کا سلامت رہنا محال تھا۔ نعیم نے اُس کو دیکھا اور پھر دیکھتے ہی اُس کی تابشِ نگاہ سے اُس کے ارادے یوں تحلیل ہونا شروع ہو گئے جیسے آفتاب کی پہلی کرن سے شبنم کے قطرے پگھل پگھل کر نابود ہو جاتے ہیں نعیم نے فردوس کے آغوش میں اِس طرح مُنہ چھپا لیا گویا وہ تلخ و ناگوار حقیقت کے اُس بھیانک دیو کی گرفت سے بچ جانا چاہتا ہے جو صبح سے اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر اُس نے رو رو کر اپنی داستانِ الم سُنائی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جدائی کی گھڑی آگئی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیونکر اس مصیبت کی تاب لا سکے گا۔ اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنی ماں کی سرزنش کا سارا قصہ فردوس کے گوش گذار کیا اور کہہ دیا کہ وہ آئندہ اُس کے ہاں نہیں آئے گا۔

فردوس نے اپنی مترنم آواز میں ہلکی سی ہنسی کے ساتھ نعیم کے کان میں کوئی افسوں پھونکا اور وہ بے تابی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ فردوس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "یاد رکھو، میں تُم کو اپنے سے کبھی جُدا نہ ہونے دوں گی۔"

نعیم نے بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا "کیونکر؟"

فردوس نے نہایت وثوق آمیز لہجے میں جواب دیا "آؤ ہم لاہور کو خیرباد کہہ کر کسی اور شہر میں چلے جائیں اور لوگوں کی زبانِ تشنیع سے بچ کر گوشۂ عافیت میں چین سے زندگی بسر کریں۔"

نعیم اس نئے خیال سے چونک اُٹھا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی ماں کا حزیں

چہرہ اُس کے اُفقِ خیال سے نمودار ہوا اور پھر فردوس کے حسین و شاداب چہرے کی شعلہ گوں تابناکی سے وہ دُھندلا سا نقش آہستہ آہستہ مٹتا چلا گیا۔ نعیم کی آواز میں خوف و ہراس کی شدت سے لرزش پیدا ہو چلی تھی۔ اُس نے رُکتے ہوئے پوچھا "یہ کیونکر ہوگا؟"

"اس طرح ہوگا۔!"

اور فردوس نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اُسے آغوش میں زور سے بھینچ لیا۔

اور پھر کہنا شروع کیا "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے؟ کون سی طاقت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر سکتی ہے؟ میں تو کئی دن ہوئے فیصلہ کر چکی ہوں کہ اب ہمیں لاہور چھوڑ ہی دینا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے گذر جائے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں"۔

نعیم رُک رُک کر کہنے لگا "لیکن۔۔۔۔۔ فردوس۔۔۔۔۔ ذرا سوچو تو۔۔۔۔۔ تم اس قدر ناز و نعمت میں رہنے کی عادی ہو بھلا کیونکر میرے ہمراہ زندگی بسر کر سکو گی۔۔۔۔۔ اور پھر تمہارے والدین۔۔۔۔۔!"

فردوس نے فیصلہ کُن انداز میں جواب دیا "خدارا اِن اندیشوں کو بالائے طاق رہنے دو۔ تم کیوں اس قسم کے وہموں میں مبتلا ہوتے ہو۔ یہ دنیا بہت وسیع ہے اور محبت کرنے والے دو دلوں کے لئے بحر و بر کا ہر ٹکڑا خلدِ بریں بن سکتا ہے"۔

اِس واقعہ کے تیسرے دن نعیم اور فردوس یکایک غائب ہو گئے اور شہر بھر میں عجیب عجیب چہ میگوئیاں، رنگ رنگ کی افواہیں اور قسم قسم کی باتیں آگ کی طرح پھیلنا شروع

ہوگئیں۔ فردوس اپنے گھر سے زیور کی صندوقچی اور کچھ نقد روپیہ بھی لے گئی تھی۔ فردوس کے والد نے جو زخمی سانپ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا پولیس میں اطلاع کر دی۔ اُس کی عزت و آبرو۔ اُس کی جاہ و حشمت۔ اُس کی خاندانی وجاہت آج خاک میں مل گئی تھی۔ وہ شہر میں کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ تاہم اُس نے ضبط قائم رکھا اور دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ اُس کی بیٹی خواہ دنیا کے آخری گوشے تک پہنچ جائے وہ اُسے ڈھونڈھ کر لے آئے گا اور جب تک نعیم کو جہنم رسید نہ کر لے اُس پر خواب و خور حرام ہے نعیم کی والدہ کو جب اس حادثے کی خبر ملی تو اُسے اعتبار نہ آتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اُس کا مظلوم، معصوم اور بھولا بھالا بیٹا بھلا کیونکر ایسی حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ وہ خیال کرتی تھی کہ یہ سب کسی دشمن کی کارروائی ہے۔ آخر جب پولیس کا افسر قضا کے فرشتے کی طرح اُس کے دروازے پر آنازل ہوا تو اُسے اِس خوفناک حقیقت کا احساس ہوا کہ اُس کا فرزند واقعی قانون کی زد میں آچکا ہے۔

دو مہینے کے بعد نعیم اور فردوس بمبئی میں گرفتار ہوگئے۔ فردوس کے والد کو کسی طریقے سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی بمبئی میں ہے۔ چنانچہ اس نے خود وہاں جا کر پولیس کی مدد سے اُنہیں گرفتار کیا۔ جب وہ لاہور آئے تو فردوس کے ماں باپ نے رو رو کر اُس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ عدالت میں کہہ دے کہ نعیم اُس کو بہکا کر لے گیا تھا۔ فردوس ابتدا میں انکار کرتی رہی لیکن جب اُس نے اپنے باپ کی گریہ و زاری دیکھی اور اُسے اپنی ماں کے بے اختیار آنسو بہتے نظر آئے تو اس کا دِل پسیج گیا۔ اُس نے

عدالت کے روبرو کہہ دیا کہ نعیم اُس کا ٹیوٹر تھا اور اُسے تاریخی مقامات دکھانے کے بہانے سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ فردوس کے والد نے اپنا اور اپنے دوستوں کا پورا اثر و رسوخ استعمال کیا اور نعیم کو تین سال کے لئے جیل بھجوا دیا۔

تین سال کی قیدِ بامشقت بھگتنے کے بعد جب وہ رہا ہوا تو دنیا ہی بدل چکی تھی وہ ایک گداگر کی طرح خانہ بدوش تھا۔ اُس کی ماں مر چکی تھی۔ دوست احباب مُنہ موڑ چکے تھے۔ عزیز و اقربا اُس کا نام سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ جیل سے نکلنے کے بعد اُس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ارض و سما کے درمیان اُسے کہاں پناہ مل سکے گی۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اِس بے بسی کے عالم میں اُس نے محسوس کیا کہ کُرۂ ارض کی اس بے پایاں وسعت میں پرندوں اور حیوانوں کے لئے جائے پناہ ہے لیکن انسان کے لئے عافیت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے لاہور کا رُخ کیا۔ یہیں اُس کے باپ کی ہڈیاں دفن تھیں۔ یہیں اُس کی ماں پیوندِ زمین ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے عروج و ترقی کے خواب دیکھے تھے اور یہیں اُس کی عزت و سربلندی کا جنازہ نکلا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اِسی شہر میں وہ اپنی کھوئی ہوئی دولت تلاش کرنے کی سعی کرے گا۔

لاہور پہنچ کر اُس نے اپنے بوسیدہ اور غلیظ مکان کا جو برسوں سے مقفل پڑا تھا دروازہ کھولا اور چور کی طرح اندر محبوس ہو گیا۔ چھ مہینے وہ اس چاردیواری سے باہر نہ نکلا۔ وہ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ تین سال کی قید کاٹ کر بھی اُس کی سزا کی میعاد ختم نہیں

ہوئی۔ اب تو وہ گویا عمر بھر کے لئے ایک قیدی تھا جو چھوٹے زنداں سے بڑے زنداں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگر وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت چکا تھا تو سماج اُسے کیوں کشادہ دلی کے ساتھ معاف نہیں کر دیتی۔ جب مقروض اپنا قرضہ ادا کر دے تو ساہوکار کا اُس پر کوئی حق نہیں رہتا۔ ایک مجرم بھی سزا پانے کے بعد اپنے قرضے سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ پھر کیوں اُس سے وہی سلوک کیا جاتا تھا جو عام طور پر متعدی امراض کے بیماروں سے روا رکھا جاتا ہے۔ لوگ اُس سے ملنا، بات کرنا اور اُس کے پاس بیٹھنا گناہ سمجھتے تھے۔ وہ جدھر سے گزرتا نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی نگاہیں اُس کا یوں استقبال کرتی تھیں۔ گویا وہ طاعون زدہ چوہا ہے جو وبائی جراثیم پھیلانے کے لئے زمین سے نکل آیا تھا۔ چاروں طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی تھی اور لوگوں کے تمسخر آمیز کلمات اُس کے دل میں زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح پیوست ہو جاتے تھے۔ کئی دفعہ محلے کے آوارہ گرد لڑکوں نے اُس کے مکان کے عین سامنے کھڑے ہو ہو کر اُس کو برا بھلا کہا تھا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر مکان کا دروازہ بند کر لیا اور دن کے وقت باہر نکلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ مہینوں گزر جاتے تھے اور اُسکی آنکھیں سورج کی روشنی میں بیرونی دُنیا کے نظارے سے محروم رہتی تھیں۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا تھا۔ لاہور سے چلے جانا اُسے منظور نہ تھا اور یہاں رہنا عقوبت کے اعتبار سے عذابِ جہنم سے کم نہ تھا۔

چھ ماہ کی مسلسل خانہ نشینی کے بعد آج وہ پہلی مرتبہ سورج غروب ہونے سے قبل گھر سے نکلا تھا۔ اُس کا دل بعض معمولی معمولی چیزوں کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ مدّت ہوئی اُس نے پرندوں کے چہچہانے کی آواز نہیں سُنی تھی۔ اس کی آنکھیں خوشرنگ

وخوشبودار پھول دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ وہ ہمیشہ گل و گلزار، سبزہ زار اور تازہ ہوا کا شوقین رہا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اکثر گھر سے باہر جاکر آبِ رواں کے کنارے بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اب گل و گلزار، آبِ رواں اور سبزہ زار اس کے لئے ایک بھولا ہوا خواب ہو گئے تھے۔ آج آخرکار اُس نے ارادہ کر ہی لیا کہ وہ زیادہ دیر اپنے آپ کو قدرت کی ان نعمتوں سے محروم نہیں رکھے گا۔ وہ کھُلے بندوں باہر نکل آیا اور دو گھنٹے لارنس گارڈن میں گھومتا رہا۔

رات ہو گئی تھی۔ باغ میں پھول، آسمان پر ستارے اور جھاڑیوں میں جُگنو چمک چمک کر تھکی ہوئی نگاہوں کو آسودگی بخش رہے تھے۔ چاند کی روشنی نے سر سے پاؤں تک زمین کو ایک نورانی لباس پہنا دیا تھا۔ نعیم ایک از خود رفتہ انسان کی طرح سب چیزوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا پھرتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ باغ سے نکل گیا۔ اُس کی رفتار میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اُس کے پاؤں خود بخود اُسے آگے بڑھائے لئے جاتے تھے وہ دیر تک سڑک پر چلتا رہا۔ برق رفتار موٹریں پاس سے گذر جاتی تھیں لیکن وہ گرد و پیش سے غافل اب خیالات میں کھویا گیا تھا۔ کھُلی فضا اور تازہ ہوا نے اُس کے دماغ کے بہت سے گوشوں کو جو معطل پڑے تھے از سرِ نو متحرک کر دیا تھا اپنی زندگی کے خوشگوار دَور کی کئی بھولی بسری باتیں آہستہ آہستہ یاد آنے لگی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب دُنیا کے ہنگامے اُسی شان سے جاری ہیں، نیکی بدی کی باہمی کشمکش اُسی تُندی سے قائم ہے، لوگ اُسی جذبۂ رقابت سے مجبور ہو کر ایک

دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ کیوں گئے گذرے دنوں کا نوحہ خواں بن کر آنسو بہاتا رہے؟ کیوں ماضی کو بھول کر مستقبل کی تعمیر کی طرف متوجہ نہ ہو؟ کیوں گذشتہ سے بے نیاز ہو کر آئندہ کی فکر نہ کرے؟ اُس نے اپنے اعصاب میں زندگی کی نئی حرکت اور خون میں زندگی کی نئی گردش محسوس کی۔

بے خبری کے عالم میں چلتے چلتے وہ نہر پر پہنچ گیا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا پتہ ہلنے کی آواز نہیں آتی تھی۔ بلند بالا درخت، چُپ چاپ کھڑے، سنتری بن کر پہرہ دے رہے تھے۔ دائیں بائیں وسیع سبزہ زار گہری نیند سوئے پڑے معلوم ہوتے تھے۔ سامنے نہر آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ اُس کا پانی مہتاب کی روشنی میں پگھلی ہوئی چاندی کے دھارے کی طرح رواں تھا۔ نعیم نے یکایک محسوس کیا کہ اُس کے دل کا تمام بوجھ ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ قدرت کے پاکیزہ حسن سے اِس درجہ قریب ہو گیا تھا کہ اُسے دنیا میں کہیں بدصورتی کی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی۔ اُس نے اپنی آگ کی طرح تپتی ہوئی پیشانی پر فطرت کے سرد و معطر ہاتھ کا لمس محسوس کیا اور اُس کا مضطرب و بے قرار دل فطرت کی میٹھی لوری کے سحر سے معصوم بچے کی طرح سو گیا۔ اُس کی آنکھیں فضا میں گڑی تھیں اور دماغ آسمان کی سیر میں مصروف تھا۔ خدا جانے وہ کتنی دیر یونہی مبہوت و دم بخود کھڑا رہا۔ پھر ہوش آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی رگ رگ سے مسرت و اطمینان کے چشمے پھوٹ نکلے ہیں، اُس کا دل خوشی سے ناچ رہا ہے اور زبان پر حمد و ثنا جاری ہے۔ اُس کی رُوح نے ماتمی لباس اُتار دیا تھا اور اُس کا غم آن کی آن میں فنا ہو گیا تھا۔

نعیم نے دل ہی دل میں کہا کہ "وہ کس قدر نادان تھا کہ یونہی جادۂ مستقیم سے بھٹکتا رہا۔

جب تک فطرت کے خزانوں کے انمول موتی اُس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں دُنیا اُسے کیونکر غریب کہہ سکتی ہے۔ جب تک قدرت کے حسین مناظر دست بستہ خدام کی طرح اُس کا دل بہلانے کو حاضر ہیں وہ کیسے غمگین رہ سکتا ہے۔ جب تک چاند کی پاکیزہ روشنی اُس کی رُوح کی خلوتوں کو منوّر کرنے کے لئے موجود ہے۔ اُس کا ظاہر و باطن کیونکر تاریک رہ سکتا ہے۔ گھاس کے زمرّدیں فرش پر شبنم کے موتی اُس کی ملکیّت ہیں، موسمِ بہار میں بُلبلِ ہزار داستاں کی نغمہ پیرائی اُس کی متاع ہے فصلِ گل میں پھولوں کی مہک، کلیوں کی چٹک اور غنچوں کا تبسم اُس کی دولت ہے۔ وہ چاندنی راتوں میں آبِ رواں کے کنارے بیٹھ کر ورد و محبت کے گیت گا سکتا ہے۔ وہ ساون کی کالی گھٹاؤں میں بارانِ رحمت سے اپنے دل کے داغوں کو صاف کر سکتا ہے۔ وہ تاروں کی محفل میں دُکھ درد کے ساتھی تلاش کر کے انہیں اپنا رازدار بنا سکتا ہے۔ پھر وہ کیوں کہے کہ وہ کارواں سے بھٹکا ہوا مسافر ہے جو یگّہ و تنہا مارا مارا پھر رہا ہے۔

وہ انسانوں کی آبادی میں ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر کاسۂ گدائی لئے پھرتا رہا لیکن اُس کی جھولی میں کسی نے خیرات کا ایک ٹکڑا نہ ڈالا۔ وہ جہاں گیا اُس کا خیر مقدم قہر آلود آنکھوں، چُبھتے ہوئے طعنوں، غیظ و غضب میں ڈوبے ہوئے لفظوں کے ساتھ ہوا۔ وہ اپنے دُکھے ہوئے دل کے لئے مرہم کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اُس کی رُوح زخموں سے چُور چُور تھی اور کہیں سے اندمال نہ ملتا تھا۔ آج قدرت کے شفا بخش ہاتھ نے مادرانہ شفقت کے ساتھ اُن رستے ہوئے زخموں پر مہر و اُلفت کا ایک پھاہا رکھ دیا تھا۔

آموں کی فصل

آموں کی فصل

چند سال کا ذکر ہے۔ تمام دوست اُس وقت کالج میں پڑھتے تھے۔ گرمی کی چھٹیاں ایک آدھ ہفتے میں ہونے والی تھیں اور ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ لاہور کو الوداع کہنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ یکم جولائی سے کالج بند ہو رہا تھا۔ ناصر اور مجید لاہور کے رہنے والے تھے۔ اس لئے جہاں تک روزمرہ زندگی کا تعلق ہے اُن کے لئے کالج کا بند ہونا یا کھلا رہنا برابر ہی تھا کیونکہ رخصتوں کا تمام زمانہ وہ یہیں بسر کرتے تھے۔ ماحول تقریباً ایک جیسا رہتا تھا صرف کالج جانے میں ناغہ ہو جاتا تھا۔ اکرم، ہریش اور اقبال ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اس لئے وہ تعطیلات لاہور سے دُور کسی اور مقام پر بسر کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

اکرم تو کشمیر جانے کے لئے گویا پابہ رکاب بیٹھا تھا۔ اپنے والد سے اُس نے اجازت منگالی تھی کہ چھٹیاں ہوتے ہی گھر آنے کی بجائے وہ سیدھا سری نگر چلا جائے گا۔ اُسے اب تک کشمیر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کشمیر کی خوبصورتی کے افسانے ہی افسانے سُن رکھے تھے۔ راولپنڈی سے سری نگر تک راستے کی دلفریبیاں اُس نے بعض دوستوں سے سُنی تھیں یا اُن کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا۔ اب وہ خود اس راستے سے گذرنے اور ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا تھا

اِس بات کے تصوّر سے وہ چوبیس گھنٹے مسرور رہتا تھا کبھی وہ سوچتا تھا کہ قدرتی نظاروں سے پُورا لطف اُٹھانے کے لئے پیدل سفر کرنا چاہیئے۔ پھر دوستوں میں بیٹھ کر نہایت غور اور انہماک سے اِس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتا تھا۔ آخر فیصلہ یہ ہوتا تھا کہ پانچ دس آدمیوں کا اکٹھے مل کر پیدل سفر کرنا تو دلچسپ مشغلہ ہے لیکن محض ایک شخص کا تنہا راولپنڈی سے سری نگر پاپیادہ جانا مناسب نہیں پیدل جانے کی تجویز کو ترک کر کے پھر ٹیکسی کا خیال کرتا تھا۔ اُس نے کشمیر کے متعلق بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے خرید لئے تھے کسی میں کشمیر کے تاریخی حالات درج تھے۔ کسی میں کشمیر کی پیداوار کا حال لکھا تھا۔ کسی میں کشمیر کے مشہور مقامات اور اندرونی راستوں کی کیفیت درج تھی۔ غرضکہ اکرم نے کشمیر دیکھے بغیر ہی کشمیر کے متعلق اتنی معلومات جمع کر لی تھیں کہ جب وہ بے تکلفی سے ڈل۔ گاندربل۔ اچھابل۔ پہل گام۔ امرناتھ۔ سری نگر اور گُل مرگ کا ذکر کرتا تھا تو سننے والے اُسے وادیٔ کشمیر کا ایک بہت بڑا سیاح سمجھتے تھے۔ وہ گذشتہ دو برس سے کشمیر جانے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ ہر سال رخصتوں کے شروع ہوتے ہی وہ کشمیر جانے کا ارادہ باندھتا تھا لیکن اُس کے والد اُسے تنہا بھیجنے پر رضامند نہیں تھے۔ مجبوراً اُسے سینے پر پتھر رکھ کر یہ ارادہ ترک کرنا پڑتا تھا۔ اب کی اُس نے لڑ جھگڑ کر اجازت لے ہی لی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بی اے میں ہو کر بھی اگر وہ تنہا کشمیر نہیں جا سکتا تو پھر اُسے زندہ رہنے کا حق ہی کیا ہے۔

ہریش نے ڈلہوزی جانے کی صلاح کر رکھی تھی۔ اُس کے والد نے جو سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے ڈلہوزی میں ایک بنگلہ خرید لیا تھا اور اب ہر سال گرمیوں کے اوائل میں وہ بال بچوں سمیت وہاں چلے جاتے تھے۔ ہریش کے لئے تین مہینے کی رخصتیں ڈلہوزی میں بسر کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ کئی برس سے اُس کا یہی معمول تھا کہ اِدھر جولائی میں کالج بند ہوا اُدھر وہ کپڑوں کا ٹرنک اور کتابوں کا پلندہ اُٹھا ڈلہوزی پہنچ گیا۔ وہاں موسم بہت خوشگوار تھا اور اُسے کام کرنے میں آسانی رہتی تھی۔ لیکن ڈلہوزی کی زندگی میں زیادہ گہما گہمی نہ تھی۔ دن بھر خاموشی سے گھر میں پڑے رہے اور شام کو پوسٹ آفس اور مال کا چکر کاٹ کر پھر گھر لوٹ آئے۔ ہریش چاہتا تھا کہ اِس مرتبہ ڈلہوزی کی بجائے کسی ایسی جگہ جائے جہاں کچھ ہنگامہ خیزی ہو اور یہ تین مہینے لطف و تفریح میں گذریں۔ یہ خواہش محض خواہش بن کر رہ گئی تھی کیونکہ ہریش کے سامنے کوئی اور پروگرام نہ تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے چار و ناچار ڈلہوزی ہی جانا پڑے گا۔

اقبال کے مقدر میں نہ کشمیر تھا اور نہ ڈلہوزی۔ اُسے تو ایک توکّل پیشہ درویش کی طرح لاہور سے نکل کر ناک کی سیدھ وطن کا رُخ کرنا تھا۔ وطن بھی جو پنجاب کے ایک دُور اُفتادہ ضلعے کے گوشے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اقبال ہر سال لاہور کی ہاؤ ہو سے نکل کر اِس کنجِ عافیت میں تین مہینے بسر کرتا تھا۔ دودھ، گھی، مکھن اور چھاچھ کی بہتات تھی۔ اس لئے تین مہینے کے مسلسل قیام سے اُس کے

وزن میں کافی اضافہ ہو جاتا تھا اور وہ موٹا تازہ ہو کر زندگی کی تگ و دو میں حصّہ لینے کے لئے پھر لاہور چلا آتا۔ اِس مرتبہ وہ بھی سوچ رہا تھا کہ کالج میں آخری سال ہے پھر فراغت کا وقت ملے نہ ملے۔ یوں بھی زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ چھٹیوں کے یہ تین مہینے تو خوش طبعی سے کہیں بسر کرنے چاہئیں۔

ایک روز شام کا کھانا کھا کر تمام دوست بیٹھے اِدھر اُدھر کی گپیں ہانک رہے تھے۔ اتفاق سے ناصر اور مجید ٹینس سے فارغ ہو کر آج گھر نہیں گئے تھے۔ اُنہوں نے بھی ہوسٹل میں کھانا کھایا تھا۔ کالج کی سرگرمیاں کچھ گرمی کی شدّت سے اور کچھ رخصتیں قریب آجانے کی وجہ سے بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ در و دیوار سے اُداسی ٹپک رہی تھی۔ اکرم نے بیٹھے بیٹھے کشمیر کا ذکر چھیڑ دیا۔

ہریش کہنے لگا "بس تمہیں تو ہر وقت کشمیر کی دُھن لگی رہتی ہے۔ میں کشمیر سے ہو آیا ہوں۔ واقعی بے نظیر جگہ ہے لیکن تم نے اپنے تخیل میں جو دنیا آباد کر رکھی ہے یاد رکھو کشمیر اُس سے کم خوبصورت ہے"

اکرم نے فوراً جواب میں کہا "میں نے تو سُنا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے تخیل سے بھی زیادہ حسین ہیں۔ ایک آگرے کا تاج محل اور دوسری وادیٔ کشمیر"۔

ہریش نے کہا "تاج محل تو میں نے دیکھا نہیں لیکن کشمیر کے متعلق یہ کہنا کہ وہ انسانی تخیل سے بھی زیادہ حسین ہے مبالغہ ہے"۔

اکرم نے جواب دیا۔ "مبالغہ ہو یا نہ ہو میں تو اس مرتبہ یقیناً کشمیر جا رہا ہوں۔ جو لوگ سوئٹزرلینڈ دیکھ چکے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ کشمیر زیادہ خوبصورت ہے۔ سچی بات ہے کہ سوئٹزرلینڈ جانے کی تو ہم میں ہمت نہیں۔ ہاں کشمیر دیکھنے کی استطاعت ہے۔ پھر کیوں نہ اس جنتِ ارضی کے نظارے سے آنکھیں روشن کریں"۔

ہریش کہنے لگا۔ "میں کہتا ہوں کہ اتنی اُمیدیں باندھ کر نہ جاؤ، نہیں مایوسی ہو گی۔ میں ہر سال ڈلہوزی جاتا ہوں لیکن اب میں اُکتا سا گیا ہوں۔ ڈلہوزی خوبصورت جگہ ہے۔ موسم کے اعتبار سے تو شاید پنجاب بھر میں ایسا صحت افزا مقام کوئی نہیں لیکن وہاں ایسی چُپ چاپ، ٹھہرے ہوئے پانی کی سی یکساں، ہموار زندگی ہے کہ ہم نوجوانوں کی بے چین طبیعتیں گھبرا جاتی ہیں۔ اب کی میں نے ڈلہوزی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ میں تو کسی رونق اور ہنگامے کی تلاش میں ہوں۔ بات یہ ہے کہ عمر کی جس منزل میں سے ہم گذر رہے ہیں اُس کو کشمیر کی پُرسکون فضا یا پہاڑوں کی خاموش سنسان زندگی سے چنداں مناسبت نہیں۔ ہمیں تو ایسے مشاغل درکار ہیں جو ہماری مضطرب اور سیماب کی طرح بے قرار طبیعتوں کو ہر وقت اپنی طرف متوجہ رکھ سکیں"۔

اقبال خاموشی سے یہ گفتگو سُن رہا تھا۔ ہریش نے جونہی فقرہ ختم کیا۔ اقبال کہنے لگا۔ "یار چھوڑو اس کشمیر وشمیر کو۔ کوئی ہاؤ ہو کی محفل برپا کرو۔ کالج میں سال بھر دماغ سوزی کرتے رہے ہیں۔ اب سر سے پڑھائی کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوئی تدبیر سوچو میں تو سمجھتا ہوں کہ دوستوں کے ساتھ اگر مجھے دوزخ میں بھی جانا پڑے تو میں دوزخ کو اُس بہشت

پر ترجیح دوں گا جس میں مجھے تنہا رہنے پر مجبور کیا جائے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہوش، تم ڈلہوزی نہ جاؤ اور اکرم، تم کشمیر نہ جاؤ۔ سب دوست مل کر یہیں کوئی پروگرام بناتے ہیں۔"

اکرم فوراً بول اٹھا "توبہ، توبہ۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مسلسل تین برس کی کوشش سے مجھے کشمیر جانے کی اجازت ملی ہے۔ اور میں اس موقع کو کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا۔"

ناصر نے کہا "میری سنو، پنجاب میں اس مرتبہ آموں کی فصل نہایت اچھی ہوئی ہے۔ کئی برس کے بعد اتنا پھل لگا ہے۔ جولائی میں برسات بھی شروع ہو جائے گی میری تجویز ہے کہ سب دوست یہیں رہیں اور بھری برسات میں آموں کا لطف اٹھایا جائے۔ آم کے سامنے کشمیر کا گلزار اور ڈلہوزی کی برف پوش چوٹیاں ہیچ ہیں کہو تمہاری کیا رائے ہے؟ میری اس تجویز پر آمین کہتے ہو یا نہیں؟"

اکرم بے تابی سے بول اٹھا "ہرگز نہیں۔ میں تو کہہ چکا ہوں کہ میں کسی قیمت پر بھی یہاں ٹھہرنے کو تیار نہیں۔ میں ہزار کام چھوڑ کر بھی کشمیر بھاگ جاؤں گا۔ تم اپنا وقت جس طرح چاہو گذارو۔ میں شرکت سے معذور ہوں۔"

ہوش کہنے لگا "میں ناصر کی تجویز کی تائید کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ ڈلہوزی نہیں جاؤں گا۔"

مجید اور اقبال یک زبان ہو کر بولے "خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ ہم تائید

مزید کرتے ہیں۔ برسات کے آثار بہت اچھے نظر آرہے ہیں اور امید ہے کہ جل تھل ہو جائے گا۔ اِدھر بارش کا پہلا چھینٹا پڑے اُدھر آموں کے ٹوکروں سے بارانِ رحمت کا خیر مقدم کیا جائے۔"

اکرم نے کہا۔ "میں عرض کر چکا ہوں کہ میں کسی شرط پر بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے ہر حالت میں کشمیر جانا ہے۔ آپ لوگ جس طرح جی چاہے تفریح کا سامان کیجئے۔ افسوس ہے کہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

ہریش نے اُٹھ کر اکرم کے ہاتھ پکڑ لئے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بالکل ایکٹنگ کے انداز میں بہت عاجزی سے کہنے لگا "اکرم میرے بھائی اکرم۔ تمہاری چشم التفات کے ساتھ باقی دوستوں کی خوشی وابستہ ہے۔ کیوں رنگ میں بھنگ ڈالتے ہو زندگیٔ عزیز کے اِن چند لمحوں کو غنیمت سمجھو۔ زمانے کی گردش خدا جانے کب شیرازہ منتشر کر دے اور ہم فکرِ معاش میں پریشان و سرگرداں ہو جائیں۔ میرا کالج میں آخری سال ہے اور تم بھی اگر آئندہ سال ایم اے میں داخل نہ ہوئے تو اِس اپریل میں کالج کو یقیناً خدا حافظ کہہ دو گے۔ پھر فرصت کے چند دن جو میسر آئے ہیں اُنہیں کیوں ضائع کر رہے ہو۔ کیا تمہیں دوستوں سے نفرت ہے یا خدانخواستہ مردم بیزاری کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے؟ ذرا اندازہ کرو کہ آسمان پر ابر چھا رہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ درخت جھوم رہے ہیں۔ بارش ہو رہی ہے اور نہر کے کنارے سب دوست جمع ہیں۔ آم کھائے جا رہے

ہیں اور گٹھلیاں ایک دوسرے کی طرف پھینکی جا رہی ہیں۔ کیا اِس لطفِ صحبت کا مقابلہ کشمیر کی سنسان اور بے کیف زندگی سے ہو سکتا ہے؟ خدا کی قسم چھوڑ دو کشمیر کا خیال۔ اور اگر تم نے ضد کی تو یاد رکھو ہم تشدد پر اُتر آئیں گے"!

ہریش یہ مختصر سی تقریر کر رہا تھا اور ناصر، مجید اور اقبال اُس کی طرف دیکھ کر بے اختیار ہنس رہے تھے۔ پھر اُس نے ایک ہاتھ اکرم کی گردن میں ڈال کر باقی دوستوں کو مخاطب کر کے کہا "کیوں بھائیو، جو کچھ میں نے کہا ہے غلط ہے"؟

سب یک زبان ہو کر چلّائے بالکل نہیں۔ ایک ایک لفظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے"

اکرم غمگین سا چہرہ بنائے کھڑا تھا اور ہریش اُس سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہا تھا میرے بھائی۔ مان جاؤ۔ چھوڑو کشمیر کو۔ کیوں ہمیں مایوس کرتے ہو"۔

اِتنے میں ناصر، مجید اور اقبال نے اکرم کو گھیر لیا اور لگے اُس کی منتیں کرنے یہاں تک کہ اکرم کو بادلِ ناخواستہ کہنا ہی پڑا "بہت اچھا۔ میں کشمیر نہیں جاؤں گا"

یہ سنتے ہی سب دوستوں نے خوشی سے ناچنا شروع کیا اور "اکرم زندہ باد" کے نعرے لگنے لگے۔ کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو یہ لوگ گھروں کو جانے کی بجائے لاہور ہی ٹھہرے رہے۔ آم شروع ہو گئے تھے۔ پنجاب کا ٹپکا تو ابھی تھوڑا ہی تھا لیکن بمبئی، بنارس، مالدہ، دربھنگہ اور سہارنپور کا آم کثرت سے آ رہا تھا۔ برسات بھی شروع ہو گئی تھی۔ اب ہر روز چن چن کر آم خریدے جاتے تھے۔ کبھی لوہاری دروازے کے

دکانداروں سے بمبئی کے الفانسو کی فرمائش ہوتی تھی۔ کبھی ناصر اور مجید میوہ منڈی کے کسی واقف چودھری کے پاس جا کر بنارس کے لنگڑے کا تقاضا کرتے تھے غرضکہ دِن بھر تو آم پرکھنے اور خریدنے میں صرف ہو جاتا تھا اور سہ پہر کو شالامار میں حوض کے قریب اور کبھی میاں میر کی نہر کے کنارے محفل جمتی اور آم خوری کا شغل زور و شور سے جاری ہوتا تھا۔ کسی روز راوی کے کنارے کامراں کی بارہ دری میں اور کسی روز شاہدرے جہانگیر کے مقبرے میں جلسہ منعقد ہوتا تھا۔ کبھی یہ بے فکروں کا مجمع لاہور کے گرد و نواح کسی باغ میں چلا جاتا تھا اور وہاں دن بھر آم کھانے میں مشغول رہتا تھا۔ کھانا کھانا تو تقریباً ترک ہو گیا تھا صرف آموں سے پیٹ بھر لیا جاتا تھا۔

اس تمام رونق اور رہاسہی میں اکرم کا دل شگفتہ نہ ہوا۔ اُسے کشمیر نہ جانے کا بہت رنج تھا۔ تاہم وہ ہنسی خوشی سے باقی دوستوں کے ساتھ ہر وقت خوش فعلیوں میں شریک رہتا تھا۔

ایک روز اکرم نے اپنے ساتھیوں سے کہا "بھئی تم نے مجھے کشمیر جانے سے تو روک ہی لیا ہے۔ اب جی چاہتا ہے کہ تمہیں آموں کی ایک ایسی شاندار دعوت دوں کہ زندگی بھر یاد رہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ جیسا شیریں اور خوش ذائقہ آم احمد نگر میں ہوتا ہے پنجاب بھر میں کہیں نہیں ملتا۔ احمد نگر میں سب سے بڑے دو باغ میرے ماموں جان کی ملکیت ہیں اور ان باغوں کا آم ہر سال تحفے

کے طور پر پنجاب کے بعض والیانِ ریاست کو بھیجا جاتا ہے۔ اگر دوستوں کی رائے ہو تو میں سب کو احمد نگر لے جانے کے لئے تیار ہوں۔ آنے جانے کا ریل کا کرایہ بھی میرے ذمّے رہا۔ وہاں دو دن ٹھہریں گے اور واپسی پر زادِ راہ کے لئے دو چار ٹوکرے بھی لیتے آئیں گے۔ آپ لوگ ایک پیسہ ہمراہ نہ لے جائیے۔ سب خرچ میں کروں گا۔ آخر جلسہ ہو تو یادگار ہو۔ یہ ٹٹ پونجیوں کی طرح آم خوری مجھے پسند نہیں۔ ماموں جان کے باغ ہیں۔ آموں کی قیمت تو دینا نہیں پڑے گی۔"

اکرم کی اس تجویز کو سب نے پسند کیا۔ اقبال کہنے لگا "کیا بات ہے ہمارے اکرم راجہ کی۔ واقعی اپنے زمانے کا حاتم ہے۔ اتنا سخی اور دوست نواز شخص دُنیا بار بار پیدا نہیں کرتی۔"

اکرم نے کہا "خیر اِس مذاق کو تو چھوڑیئے۔ تجویز یہ ہے کہ پرسوں دوپہر کا کھانا کھا کر ایک بجے کی گاڑی سے چلیں۔ چار پانچ بجے کے قریب احمد نگر پہنچ جائیں اور شام کو جلسہ ہو گا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ بار بار کہتے ہوئے شرم آتی ہے سب خرچ میرے ذمّے ہو گا۔ آپ لوگ تکلیف نہ کیجئے گا۔"

اتفاق سے جس روز یہ قافلہ روانہ ہوا موسم بھی حد درجہ خوشگوار تھا، بادل گِھرا ہُوا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اکرم نے ریل کے پانچ ٹکٹ خریدے۔ تمام راستہ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ اکرم کی طبیعت آج خوب کھلی ہوئی تھی بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ ساڑھے چار بجے احمد نگر کا اسٹیشن آیا۔ تھوڑی تھوڑی

پھوار پڑ رہی تھی۔ اکرم نے کہا" میری صلاح ہے سیدھے باغ چلتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر ماموں صاحب کے مکان پر چلیں گے"۔

ناصر نے جواب دیا" بھائی تم مالک ہو۔ جو نیّت امام کی وہی سب کی"۔

اسٹیشن سے تانگوں میں سوار ہو کر چند ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر سے گذرتے ہوئے یہ لوگ ایک باغ میں پہنچے۔ باغ بہت بڑا تھا جس کے گرداگرد پختہ فصیل کھنچی ہوئی تھی۔ اندر سینکڑوں درخت آموں سے لدے ہوئے کھڑے تھے۔ اکرم نے ایک طرف جا کر ایک شخص سے بات کی اور پھر دوستوں کے پاس آ کر کہنے لگا "معلوم ہوا ہے کہ ماموں صاحب نے اس مرتبہ باغ ٹھیکہ پر دے دیا ہے۔ خیر کوئی حرج نہیں۔ یار لوگوں کا حصہ تو نکل ہی آئے گا"۔

ایک بہت بڑی بالٹی میں کوئیں کا تازہ ٹھنڈا پانی ڈالا گیا اور پھر اُسے نہایت خوش رنگ چھوٹے چھوٹے آموں سے بھر دیا گیا۔ سب دوست سبزے کے فرش پر بے تکلفی سے بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر آم کھانے لگے۔ اِس طرح کوئی ایک گھنٹہ گذرا ہو گا کہ اکرم نے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں ماموں صاحب سے مل آؤں۔ ممکن ہوا تو میں اُنہیں اپنے ہمراہ یہیں لے آؤں گا۔ آپ اُن سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔ بہت زندہ دل بزرگ ہیں"۔

باقی دوستوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ صرف ہریش نے کہا "ذرا جلدی آنا"!

اکرم نے جواب دیا "میں ابھی آدھ گھنٹے تک آتا ہوں۔ آپ اطمینان سے آم کھائیے یا باغ کی سیر کیجئے"۔

اکرم سیدھا ریل کے اسٹیشن پر پہنچا اور سات بجے والی گاڑی سے لاہور چلا گیا۔ اُدھر باغ میں وہ لوگ بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ چھوڑ جب پورا ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا تو اُن کی بے چینی بڑھی۔ باغ والے نے آموں کی قیمت طلب کی تو وہ حیران ہو کر ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ آخر ناصر نے کہا "اکرم صاحب کو آنے دو۔ یہ باغ اُن کے ماموں ہی کا تو ہے"۔

باغ والے نے تن کر کہا "کون اکرم صاحب؟ یہ باغ تو لالہ ایشرداس ساہوکار کا ہے"۔

اب اِن کے اوسان خطا ہوئے۔ پیسہ تو کسی کے پاس تھا نہیں۔ اتفاق سے مجید کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکل آیا۔ آموں کے دام دیئے اور یہ لوگ باغ سے نکلے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ احمد نگر میں نہ اکرم کے ماموں رہتے ہیں اور نہ اُن کا وہاں کوئی مکان یا باغ ہے۔

رات بھر یہ دوست ایک ذلیل سی سرائے میں پڑے رہے۔ صبح ہوئی تو کچھ نہ پوچھیے کہ کس مصیبت سے بھک منگوں کی صورت بنا کر لاہور پہنچے۔ اکرم سری نگر جا چکا تھا۔

حورِ صحرا کے نام

حورِ صحرا کے نام

میں سوچتا ہوں کہ یہ دن رات کی محنت، یہ صبح و شام کی مشقت آخر کس لئے؟ یہ راتیں جاگ جاگ کر آنکھوں میں کاٹنا، یہ دن بھر سرگرداں و پریشاں ہو ہو کر پھرنا آخر کس واسطے؟ میری شام و سحر کی محنت میری شب و روز کی کاوش کا انجام کیا ہے؟ راتوں کی دیدہ ریزی اور دنوں کی جانفشانی سے کیا مقصود ہے؟

شہرت کی خواہش؟ دولت کی ہوس؟ نام و نمود کی چاہت؟

میں نے اگر سیم و زر کے انبار جمع کر بھی لئے، میرا نام اگر بحر و بر کی دُور دراز پہنائیوں تک پہنچ بھی گیا اور میرے قلم کی سحر طرازیوں نے اگر دنیا کو محوِ حیرت بنا بھی دیا تو کس کام کا؟ میں جب تک اُس کی نگہہ التفات سے محروم ہوں زر و جواہر کے خزانے ہیچ ہیں ہفت افلاک کی شہرت بے معنی ہے اور شعر و ادب کی ہنگامہ آرائی بے سود۔

پھر سوچتا ہوں کہ یہ شعر و ادب ہے کیا؟ بس اُس کی ایک جھلک کے بھڑکائے ہوئے شعلوں کی تپش، اُس کی ایک نظر کے برپا کئے ہوئے طوفانوں کی لہر اور اُس کی ایک آواز کے متحرک کئے ہوئے نغموں کا ترنم۔ شعلوں کی اِس تپش، طوفانوں کی اس

لہر اور نغموں کے اس ترنم نے میری زندگی کو تہ وبالا کر دیا ہے لیکن میرے دل و دماغ کی دنیا اسی تپش، اسی لہر اور اسی ترنم سے آباد ہے۔ یہ چیزیں مجھ سے چھین لو اور میں اس بے آب و رنگ دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش سے دست بردار ہو جاؤں گا

یہ شعر گوئی، یہ نغمہ خوانی، یہ افسانہ سنجی صرف اس اُمید پر حاصل کی تھی کہ اپنے دل کے درد، اپنی روح کے گداز اور اپنی جان کے روگ سے اُسے آگاہ کر سکوں گا۔ یہ ادب و انشا کی زندگی محض اس خیال سے اختیار کی تھی کہ الفاظ کے پردے میں اپنے زخموں کی خلش، اپنی آہوں کی جلن اور اپنی آنکھوں کی سوزش اُسے دکھا سکوں گا، لیکن میری تیرہ بختی کہ جگر خون ہو ہو کر آنکھوں سے بہتا رہا، شرربار آہوں سے جسم و جان جل جل کر راکھ ہو گئے، زخموں نے رس رس کر ناسور کی صورت اختیار کر لی اور وہ میرے حالِ تباہ سے بے خبر، میرے رنج و الم سے غافل میرے درد و کرب سے بے نیاز اطمینان سے دنیا کا تماشہ کرتی رہی۔ ہائے ؎

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

لوگ کہتے ہیں میرے الفاظ میں مقناطیس کی قوت، بجلی کی تڑپ اور شعلوں کی حدّت پنہاں ہے میرے حریف حیران ہیں کہ میرے کلام میں سوز میرے بیان میں سحر اور میری انشا میں رنگینی کہاں سے آئی۔ وہ شاید سمجھتے ہیں کہ لغت کے قواعد اور محاورے کی پابندیاں زبان کو معجز بیانی اور قلم کو جادو نگاری کی طاقت

بخش دیتی ہیں لیکن آہ یہ راز دوست دشمن سبھی سے پوشیدہ رہا کہ میری بے کیف زندگی جب تک اُس کے جلووں سے منور نہ ہوئی تھی، میرے لیل و نہار کا بے روح و بے ذوق تسلسل جب تک اُس کی نگاہوں کے سحر سے پاش پاش نہ ہُوا تھا اور وہ جب تک اپنے حسن و جمال کی تابانیوں کے ساتھ میرے اُفقِ حیات پر چودھویں کا چاند بن کر نمودار نہ ہوئی تھی میرے الفاظ میں نہ مقناطیس کی کشش تھی اور نہ بجلی کی چمک۔ میری زبان میں تاثیر تھی اور نہ میرے قلم میں روانی۔ اُس نے بھولے سے ایک نظر مجھ خانماں خراب پر ڈال دی اور یہ سوئے ہوئے فتنے یک بارگی جاگ اُٹھے، بجھی ہوئی چنگاریاں انگاروں کی طرح دہکنے لگ گئیں اور سازِ زندگی کے ٹوٹے ہوئے تاروں سے نشاط و کامرانی کے نغمے پھوٹ کر بہ نکلے عشق فصاحت و بلاغت کا سب سے بڑا معلّم ہے۔ جب دل اُس کی شعاعوں سے جگمگانے لگتے ہیں، جب رُوحیں اُس کے نغموں سے وجد میں آتی ہیں اور جب حواس پر وہ ایک خمار بن کر چھا جاتا ہے تو زبان حقائق و معارف کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اور قلم ازل و ابد کے اسرار کے پردے چاک کر دیتا ہے۔

میرے دل و دماغ پر حکومت کرنے والی ساحرہ! تیری ایک نگاہ نے میری دنیا بدل ڈالی۔ میری زندگی کی شاہراہ کس قدر تاریک تھی، تُو نے ایک لمحہ کی مسکراہٹ سے اُسے دُور دُور تک روشن کر دیا۔ یہ صبح و شام کی فرسودگی، یہ لیل و نہار کی گردش دلآویزیوں سے محروم ہو چکی تھی۔ تُو نے آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور جس طرح سورج

کی پہلی کرن کے ساتھ کائنات کے مردہ جسم میں حیاتِ تازہ کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میری مضمحل وافسردہ زندگی تیرے جمالِ جاں فروز کے پرتو سے چمک اُٹھی ہے

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریٔ دل
التفات اُن کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

یہ کاہشِ فراق، یہ تجھ سے دُور رہنے کی اذیت، یہ تجھ تک نہ پہنچ سکنے کی بے کسی مجھے ہلاک کئے دیتی ہے۔ پھر یہ سب کچھ ایک روز کا دُکھ ہو تو صبر بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب حالت یہ ہے کہ دن رات میں کوئی لمحہ تیری یاد سے غافل اور شام و سحر کا کوئی وقفہ تیرے تصور کے بغیر نہیں گزرتا تو بتا میں دلِ ناداں کو کہاں تک تسلیاں دے دے کر بہلاتا رہوں۔ جانتا ہوں کہ تیری عیش و آرام میں ڈوبی ہوئی زندگی میرے رنج و اضطراب سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس پر بھی اپنے دلِ غم نصیب کے اُن خونچکاں گوشوں کو بے نقاب کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جن کی ایک جھلک شاید دنیا سے مسرت و نشاط کا وجود فنا کر دے

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ تجھے صحرا کی زندگی کیوں پسند آ گئی ہے؟ تیرا یاسمینی جسم جو مہتاب کی کرنوں سے بڑھ کر حسین و جمیل اور موسمِ بہار میں کھلنے والے پھولوں سے زیادہ معطر و شاداب ہے ریگستان کی گرم ہواؤں کی کیونکر تاب لا رہا ہے؟ کیا اس لئے کہ لیلےٰ کو نجد اور عذرا کو یمن عزیز تھا اور تو نے بھی دل نوازی و دلبری کی انہی روایات کو زندہ رکھنے کی خاطر ہندوستان کا وہ ریگزار

منتخب کر لیا ہے جہاں حُسن ہمیشہ ناوک افگنی اور ہمیشہ جاں کنی میں مصروف رہتا ہے؟

اگر یہ چند سطریں تیری نظر سے گزریں ــــ آہ مجھے اپنے بختِ نارسا سے اِس کی توقع نہیں ــــ تو سمجھ لیجو کہ قدرت نے تجھے لیلیٰ روشی سکھا کر مجھ مجور و حرماں نصیب کو قیس کی سوختہ سامانی عطا کرنے میں بخل نہیں کیا۔

جوانی کا خواب

جوانی کا خواب

آصف کو ہر لمحہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کی طبیعت پر مُردنی سی چھا رہی تھی۔ اُس کا دل زندگی کے ہنگاموں کی طرف پہلی سی شدّت کے ساتھ راغب نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے حواس اپنے گرد و پیش کی دلچسپیوں سے اُس بے تابی سے متمتع نہیں ہوتے تھے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے اُس کا شیوۂ خصوصی تھا۔ اور یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہو رہا تھا کہ اُس کا سن تیس سے متجاوز نہ ہوا تھا۔ اُس کا پچیس ہزار روپیہ بنک میں جمع تھا، اُس کی جائداد کے چند قیمتی ٹکڑے موجود تھے اور اُس کا مکان عیش و مسرّت کے اُن تمام اسباب سے لبریز تھا۔ جو دورِ حاضر کی کاوش نے فنونِ لطیفہ اور سائنس کے امتزاج سے وضع کئے ہیں۔ اُسے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ یہ بے دلی، یہ اضمحلال، یہ تکدّر کس حادثے کا نتیجہ ہے؟ کیا جوانی اُسے جواب دے رہی تھی؟ کیا وہ آگ جس سے اُس کے اعصاب مشتعل رہتے تھے، بُجھ رہی تھی؟ کیا وہ طوفان جس کی لہریں اُسے مشرق و مغرب کی پہنائیوں میں اُڑائے پھرتی تھیں اُتر رہا تھا؟ زندگی کا درشت پہلو اگر ابھی سے آنکھیں دکھانے لگا تو مستقبل کا کیا حشر ہوگا۔

وہ وقت کو گھر کا غلام اور روپے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھ کر زندگی بسر کرنے کا

عادی تھا۔ دنیا کی رائے کو اُس نے ہمیشہ ٹھکرا دیا تھا۔ طعنِ خلق کی اُس نے کبھی پروانہ کی تھی اور تحسین و مذمت سے متاثر ہونا وہ جانتا ہی نہ تھا۔ پھر آج وہ کیوں اس قدر مضمحل و دل گرفتہ نظر آتا تھا؟ اُس کا دماغ نامعلوم خدشات پیدا کر کے کیوں اُس کے اعصاب پر لرزہ طاری کر رہا تھا؟ اُس کی آنکھیں کیوں خلا میں بھیانک تصویریں دیکھ کر آپ ہی آپ بند ہو رہی تھیں؟ کیا یہ سب کچھ اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ انسان کا ہر فعل، خواہ وہ سات پردوں میں چھُپ کر کیا جائے اپنے پیچھے طبعی نتائج کی ایک زنجیر چھوڑ جاتا ہے؟ کیا یہ اس بات کی شہادت تھی کہ جسم کی ہر حرکت خواہ وہ کیسی ہی خفیف ہو نفس کی دنیا میں اپنا ردِ عمل پیدا کرنے سے رُک نہیں سکتی؟

وہ اب تک اِس بات سے واقف نہ تھا کہ نفس کی ملامت یا ضمیر کی سرزنش بھی کوئی چیز ہے، اُسے اب تک اس بات کا احساس نہ ہُوا تھا کہ جسمانی لذتوں سے سرشار ہونے کے بعد کبھی کبھی یہی سرشاری طبیعت کے لئے بارِ گراں اور روح کے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ آج کہ وہ پہلی مرتبہ اِس احساس سے آشنا ہو رہا تھا، آج کہ اُس کی سوئی ہوئی روح پہلی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی اُس پر حزن و ملال اور رنج و بیکسی کی گھٹا چھا گئی تھی۔ وہ حیران تھا کہ وہی چیزیں جو اُس کے قلب کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں آج کیوں اُنہیں متحرک کرنے سے عاجز ہیں، وہ باتیں جو اُس کے مزاج میں شگفتگی، اُس کے

دماغ میں سرور اور اُس کے خیالات میں تازگی لے آیا کرتی تھیں۔ آج کیوں اپنا اثر نہیں دکھاتیں۔ اُسے رہ رہ کر محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کی لذتیں ختم ہو چکی ہیں عیش و تنعم کا ذخیرہ خالی ہو گیا ہے۔ عشرت کی راہیں پامال کی جا چکی ہیں اور اب اُسے جس سرزمین سے گذرنا ہے وہاں لٹے ہوئے قافلے کے نشان، مرے ہوئے انسانوں کے ڈھانچ اور بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں۔

اُس کی جوانی نے جب آنکھ کھولی تو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک متموّل کنبے کا تنہا نورِ نظر ہے۔ ایک دولت مند، ذی ثروت خاندان کی محبت و شفقت کا واحد مرکز ہے۔ اُس کے والد کا سایہ بچپن ہی میں اُس کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اِس لئے اُس کی تعلیم و تربیت ابتدا سے اُس کی ماں کی توجہ کی محتاج رہی تھی۔ اُس نے ایک سعادت مند بچّے کی طرح ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں پچھلے وقتوں کی وضعداری اور تہذیبِ قدیم کی روایات کا اثر شدّت سے موجود تھا۔ وہ عمر میں جوں جوں بڑھتا گیا اُس کے اندر یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ وہ ایک رئیس زادہ ہے اُسے عام لوگوں سے ملنے جلنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے نشست و برخاست میں ایسا سلیقہ پیدا کرنا لازم ہے جو صرف اُمراء کے لئے مخصوص ہے۔ گھر بار پہ حکومت کرنا اور چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے خدّام کو جو دست بستہ حاضر رہنے کے عادی تھے، زجر و توبیخ کرنا اُس کا پیدائشی حق ہے۔

اِن حالات کے اندر اُس کے ذہن کی ساخت اور اس کے دل و دماغ

کی کیفیت وہی صورت اختیار کر گئی جو ایک خود مختار ریاست کے ولی عہد کی ہوتی ہے۔ سترہ سال کی عمر میں وہ اسکول کی تعلیم ختم کرکے کالج میں داخل ہو گیا یہاں اُس نے دیکھا کہ اُس کے گرد و پیش بہت سے نوجوان ہیں جو فارغ البال زندگی بسر کرنے اور دنیا کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہونے میں اُس سے بڑھ چڑھ کر حیثیت کے مالک ہیں۔ اِس چیز نے اُس کی خود پرستی کو جس کے اندر وہ اب تک محصور چلا آرہا تھا ٹھیس لگائی۔ اُس نے اِس کی تلافی روپے سے کرنا چاہی چنانچہ اُس کے اخراجات میں اسراف کا پہلو غالب نظر آنے لگا۔ اُس نے سواری کے لئے موٹر کار خرید لی اور بعض ایسے کم استطاعت طلبہ جو دوسروں کی دولت سے فائدہ اٹھانے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اُس کے گرد طواف کرنے لگے، آہستہ آہستہ وہ اس راہ پر چل نکلا جہاں ذمّہ داری کے احساس سے معرا اور دنیا کی رنگا رنگ دلآویزیوں کے شوقین چلنے کے عادی ہیں، لیکن اب تک اُس کا شوق صرف خوبصورت لباس پہننے، بہترین درزی سے انگریزی طرز کے کپڑے سلوانے، عالی شان مکان میں رہنے، سواری کے لئے اعلیٰ درجے کی موٹر رکھنے، مکان کو زرنگار پردوں، بیش قیمت قالینوں اور جاذبِ نظر تصویروں سے سجانے اور کمروں کو آبنوس اور ہاتھی دانت کے ولائتی فرنیچر سے آراستہ کرنے تک محدود تھا۔

یکا یک اُس کی زندگی میں ایک تغیّر رونما ہوا۔ اُس کے مرحوم والد کے

ایک دوست کا کنبہ جو موسمِ گرما کشمیر میں بسر کرنے کے بعد واپس وطن کو جا رہا تھا۔ آصف اور اُس کی والدہ سے ملنے کے لئے چند روز اُن کے ہاں ٹھہر گیا۔ آصف نے اپنی والدہ سے اِن لوگوں کا حال کئی مرتبہ سُنا تھا کہ اُس کے باپ کی زندگی میں یہ دونوں خاندان کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے تھے آپس کا ربط و ضبط کس قدر بڑھ گیا تھا اور وہ کس پیار سے ایک دوسرے کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ پھر اُس کے باپ کا یہ دوست جو سرکاری ملازمت کی وجہ سے پنجاب میں مقیم تھا یو پی تبدیل ہو گیا۔ وہیں اُن کا وطن تھا۔ اِس لئے گھر کے باقی لوگ بھی پنجاب کو الوداع کہہ کر یو۔ پی میں جا بسے۔ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا کہ اِس دوران میں اُس کے والد کا انتقال ہو گیا اور طرفین کا یہ تعلقِ خاطر مدھم پڑ گیا۔ اُس کے باپ کی موت کے بعد اُن کا یہ دوست تعزیت کے لئے صرف ایک مرتبہ پنجاب آیا تھا لیکن آصف اُس وقت بچہ تھا۔ اِس لئے اُس کے دماغ میں اس کنبے کے افراد کا کوئی نقش باقی نہ تھا۔ اب اُس نے سُنا کہ وہی بھُولے ہوئے لوگ اُس کے ہاں مہمان آ رہے ہیں تو اُسے رہ رہ کر اپنا باپ یاد آنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے مختلف نقشے بن بن کر بگڑ رہے تھے۔ اُس نے ارادہ کیا کہ وہ اِس کنبے کی خاطر مدارات میں کوئی کسر باقی نہ رکھے گا اُن کے آرام و آسائش کا انتظام کرنے میں پوری مستعدی سے کام لے گا۔ اور اُنہیں احساس کرا دے گا کہ وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ہے۔

جب وہ لوگ آئے تو آصف پورے ساز و سامان سے استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا۔ اُس کے باپ کا دوست ایک دوہرے بدن کا وجیہ آدمی تھا جس کے چہرے سے خشونت آمیز متانت کے آثار ٹپک رہے تھے۔ ساتھ دو برقع پوش عورتیں اور دو نوعمر لڑکے تھے۔ عورتوں میں ایک اُن کی بیوی اور دوسری صاحبزادی تھی۔ نوعمر لڑکے اُن کے بیٹے تھے۔ جب یہ مہمان گھر پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی اُس کی والدہ کے زار و قطار آنسو بہنے لگ گئے۔ اُسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب اُس کا مرحوم شوہر صاحب خانہ کی حیثیت سے اِن کی پذیرائی میں دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ ایک ہفتہ آصف کے ہاں ٹھہرے۔ گذری ہوئی باتیں دہرائی گئیں۔ کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی کے قصے بیان کئے گئے۔ ماضی کے غم و مسرت اور مستقبل کے عزائم کا ذکر ہوا۔ غرضکہ ہفتہ بھر اچھی رونق رہی۔ آصف اپنے مہمان کو چچا اور ان کی بیوی کو چچی کہہ کر پکارتا تھا۔ اُن کی صاحبزادی جس کا نام جمیلہ تھا سترہ اٹھارہ برس کی بہت قبول صورت اور شائستہ مزاج لڑکی تھی۔ روانگی کے وقت آصف نے جمیلہ کو قسم قسم کے بیش قیمت تحائف سے گویا لاد دیا۔ تحائف میں طلائی زیور، ساڑھیاں، عطردان، ولائتی غازے، ریشمی پارچات، سنگار کی چیزیں اور تصویروں کے البم شامل تھے۔ جمیلہ بہتیرا انکار کرتی رہی۔ اُس کی والدہ نے بھی بہت کچھ تامل کا اظہار کیا۔ لیکن آصف نے ایک نہ سنی اور سب اشیاء اُن کے ہمراہ کر دیں۔

یہ لوگ چلے گئے تو آصف ملول اور افسردہ سا رہنے لگا۔ اُسے اپنی دلچسپیاں پھیکی پھیکی سی نظر آنے لگیں۔ موٹر کی سواری، مکان کی آرائش، خدم و حشم کی کثرت، لباس ہائے فاخرہ کی جدت، یہ چیزیں تھیں جن کے وسیلے سے اُس کا تموّل وقتاً فوقتاً اپنا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن اب امارت کے یہ تمام مظاہر بے جان سے ہو کر رہ گئے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے مکان کی ساری زیبائش سے، جو اُس کے مذاقِ سلیم اور اُس کی شبانہ روز کاوش کی شرمندہ تھی، کسی پُراسرار طریقے سے حُسن و لطافت کی روح کھینچ لی گئی ہے۔ یہ تبدیلی کیونکر ہوئی اور آصف کی اس غمگینی کی تہ میں کس کا ہاتھ کام کر رہا تھا؟

اُسے رہ رہ کر جمیلہ یاد آتی تھی۔ وہ بار بار سوچتا اور حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھنے لگ جاتا تھا کہ اُس نے جمیلہ کو جس قدر تحفے دئیے تھے اُن میں ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو اُس سے اُس پرستارانہ نیائش، اُس جذبۂ مفتونیت اور اُس شوقِ گلوگیر کی ترجمانی کر سکے جس کی خلش آصف کو ہر گھڑی بے چین کر رہی تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹ جاتا اور بغیر آنکھ جھپکے چھت کی طرف دیکھتا رہتا۔ ساڑھیاں، طلائی زیور، ریشمی پارچات، عطردان، ولائتی غازے، سنگار کا سامان ایک ایک کر کے یہ سب چیزیں اُس کے تخیل کی آنکھوں کے سامنے آ جاتیں۔ پھر وہ خیال ہی خیال میں دیکھتا کہ جمیلہ کا مرمریں جسم اُس کی ساڑھی میں جس سے عطر کی خوشبو کی لپٹیں نکل رہی ہیں ملبوس ہے۔ اُس کے گلگوں رخسار اُس کے غازے سے کُندن کی طرح دمک

رہے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں اُس کے سُرمے کا دنبالہ ہے۔ اُس کے بالوں میں اُس کے عنبر کی مہک ہے۔ اُس کے کانوں میں اُس کے آویزے ہیں۔ اُس کے ہاتھوں میں اُس کی پتلی پتلی چوڑیاں ہیں۔ اور وہ بُت خانے کی دیوی کی طرح بنی ٹھنی، دُلہن کی طرح سجی سجائی، شرما شرما کے لجا لجا کے قدِ آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی ہے۔ آصف کے دبے ہوئے ہونٹوں سے ایک آہ نکل جاتی۔ وہ سوچتا "کیا یہ ممکن ہے کہ عطر اور غازے کی مہک کے ساتھ میری آہوں کی گرمی بھی اُس کے دل تک پہنچ جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اُس کا جسم ساڑھی کے لمس کے ساتھ اس سوزِ ناتمام کی حدّت کو بھی محسوس کرے جس سے میں خود آتش بجاں ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اُس کی سرمگیں آنکھیں اُس شوقِ دید کی بے پناہی کو بھی دیکھ لیں جس سے میری جانِ زار آتشکدہ بن گئی ہے"؟

آصف بے قرار رہنے لگا تھا۔ اُسے اپنے محبوب مشاغل بے رونق نظر آتے تھے۔ وہ خوبصورت تصویروں، پتھر کے دلآویز مجسّموں اور عہدِ عتیق کے تاریخی نوادر سے اپنا مکان سجانے کا شوقین تھا۔ لیکن اب اُسے ان چیزوں سے کوئی رغبت نہ رہی تھی۔ اُس نے صانعِ ازل کا وہ جیتا جاگتا شاہکار دیکھ لیا تھا جس کی آب و تاب کے سامنے مصوّری کے نقوش بے جان و بے کیف ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس کے دل کے مندر میں ایک ایسی سندر مُورتی آبیٹھی تھی کہ سنگتراشی کے نمونے اور پتھر کے حسین و جمیل مجسّمے اُس کے سحرِ جمال کے سامنے اپنا جادو کھو بیٹھے تھے۔ آصف جذبات

کے اِس بحران میں مبتلا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنا کھویا ہوا سکونِ قلب کیونکر حاصل کرے کہ ایک روز جمیلہ کے والد کا خط آ گیا۔ اُنھوں نے خیریت سے منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی۔ آصف اور اُس کی والدہ کا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔ اور اخیر میں شفقتِ پدری سے کام لے کر آصف کو یقین دلایا تھا کہ وہ اُسے اپنے بچوں کی طرح عزیز سمجھتے ہیں۔

آصف کو خط کے مطالعہ سے مایوسی ہوئی۔ اُس میں جمیلہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔ صرف ایک جگہہ آصف کی والدہ کے نام جمیلہ کا سلام درج تھا۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ کیا دل کو دل سے راہ نہیں ہوتی؟ کیا محبّت کا دیوتا ایک ہی تیر سے دو دلوں کو مجروح نہیں کرتا؟ کیا جمیلہ اس راز سے بے خبر تھی کہ اُس کی یاد کسی کی جان کا روگ بن کر رہ گئی ہے؟ آخر اُس نے ڈرتے ڈرتے کانپتے کانپتے جمیلہ کے والد کو جواب لکھا۔ بہت ادب سے اُن کی بزرگانہ شفقت کا شکریہ ادا کیا۔ جمیلہ اور اُس کی والدہ کو اپنا خلوص بھرا سلام بھجوایا۔ خط ختم کرنے کے بعد آصف نے کئی بار اُسے پڑھا۔ بہت معمولی رسمی سی تحریر تھی۔ لیکن اُسے رہ رہ کر یقین ہوتا تھا کہ یہ خط ضرور جمیلہ کی نظروں سے گذرے گا۔ کاش وہ جادو نگاری کے کسی ایسے راز سے واقف ہوتا۔ سحر طرازی کے کسی ایسے انداز سے آگاہ ہوتا کہ اس معمولی، رسمی، بے کیف سے مکتوب کے بین السطور اپنے اضطراب کو اِس ہنرمندی سے منکشف کر دیتا کہ صرف جمیلہ ہی اُس سے باخبر ہو سکتی۔

آصف جس قدر جمیلہ کو بھول جانے کی کوشش کرتا اُسی شدّت سے اُس کا

خیال دل و دماغ پر حاوی ہوا جاتا تھا۔ اُس کی بے قراری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے کئی بار ارادہ کیا کہ براہِ راست جمیلہ کو خط لکھے۔ اُس کو اپنی موجودہ کیفیت سے آگاہ کرے اُس سے تھوڑے سے التفات کی بھیک مانگے۔ لیکن پھر فوراً ہی جمیلہ کے والد کی خشونت آمیز متانت اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی اور وہ خوف سے گھبرا جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مسلمان شرفائے گھروں میں بالعموم یہ قاعدہ ہے کہ ناکتخدا لڑکیوں کے نام جتنے خطوط آتے ہیں اُن کے والدین کی تجسس آمیز نگاہوں کی تشفی کئے بغیر اندر نہیں جانے پاتے اگر اُس کا خط جمیلہ کے والد کے ہاتھ آگیا تو کیا بنے گا۔ اور اگر وہ خط سیدھا جمیلہ کے پاس پہنچ بھی گیا تو اس کا کیا اعتبار ہے کہ وہ آصف کی جسارت سے ناراض ہو کر اُس کا ذکر اپنے والد سے نہ کر دے۔

آخر ایک روز آصف جذبات کی اُس کشمکش سے مغلوب ہو گیا۔ وہ اپنی والدہ کے پاس بیٹھا تھا کہ بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس کی والدہ نے حیران و پریشان ہو کر اُسے گود میں لے لیا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور اُس کا منہ چومتے ہوئے بڑے اضطراب سے اُس کے رونے کی وجہ دریافت کی آصف نے جس کی ہچکیاں اب تک نہ رُکی تھیں، ٹھہر ٹھہر کر، ٹوٹے ہوئے لفظوں میں اپنے دل کا درد اپنی شفیق و غمگسار ماں کے سامنے بیان کر دیا۔ پہلے تو اس معمر خاتون کے دل میں اُس قتالہ کے خلاف جس نے اُس کے لختِ جگر کا آرام اور چین تباہ کر دیا تھا غیظ و غضب کا ایک شعلہ بلند ہوا۔ لیکن جب آصف نے جس

کے آنسو ساون کے مینہ کی طرح بہے چلے جا رہے تھے، رو رو کر اپنی ماں کے سامنے اپنے زخموں کو بے نقاب کیا تو اُس کی ماں نے بھی، جو زمانے کا سرد و گرم اچھی طرح دیکھے ہوئے تھی، اپنے نورِ نظر کو تسلّی دیتے ہوئے کہا کہ میں کل ہی جمیلہ کی والدہ کو خط لکھ کر تمہاری بات پکّی کرتی ہوں"۔

دوسرے روز آصف کی والدہ نے جمیلہ کی والدہ کو اپنے ہاتھ سے خط لکھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو اُن کی غلامی کے لئے پیش کیا ہفتے عشرے کے بعد ایک روکھا پھیکا جواب آیا کہ جمیلہ کی نسبت اپنے خاندان میں ایک عزیز سے طے ہو چکی ہے۔ اِس لئے آصف کی درخواست کو شرفِ قبول حاصل نہیں ہو سکتا آصف کو یوں محسوس ہوا گویا اُسے ایک تاریک اور عمیق غار میں اوندھے مُنہ دھکّا دے دیا گیا ہے۔ جہاں سے اب وہ کبھی باہر نہ آسکے گا۔ اِس مایوسی، اِس حزن و ملال اور اِس رنج و بیکسی میں آصف کو اپنے آپ سے نفرت ہو چلی تھی۔ کیا وہ ایسا ہی حقیر و ناچیز، ایسا ہی بے وقار و ذلیل انسان تھا؟ کیا اُس کا تموّل، اُس کی ذاتی لیاقت اور اُس کی خاندانی وجاہت اس قابل نہ تھی کہ وہ ایک متوسّط درجے کے خاندان کی شریف زادی کے لائق تصور کیا جاتا؟

اُسے اپنی توہین اور بے عزتی کا ہر گھڑی احساس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت بلند، بہت ارفع اور بہت معزز سمجھتا رہا تھا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ وہ فریبِ خیال میں مبتلا تھا۔ اُس کے غرور کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ وہ اُس

شکستِ پندار کی تلافی کے لئے بے تاب نظر آتا تھا، لیکن ساتھ ہی وہ حیران تھا کہ اس ذلت کا انتقام کیونکر لے، اپنی مجروح شدہ عزتِ نفس کی بحالی کے لئے کون سے وسائل اختیار کرے۔ اِس اُلجھن اور ادھیڑ بن میں وہ اپنی تعلیم سے بھی غافل سا ہو گیا تھا۔ اُس کے دوست شاکی تھے کہ اب وہ مجلسِ احباب میں شریک نہیں ہوتا، کھیل کود اور تفریح کے مشاغل میں اُن کے ساتھ حصّہ نہیں لیتا۔ آصف نے بھی غیر شعوری طور پر اس درد کا مداوا تلاش کرنے کے لئے دوستوں کی طرف توجہ کی اُس کا ایک دوست رحمٰن بہت زندہ دل اور خوش مزاج ہونے کے ساتھ رمز شناس اور معاملہ فہم بھی تھا۔ آصف نے اُسی کو اپنا رازداں بنانا مناسب خیال کیا چنانچہ جب وہ اپنے دُکھ درد کی ساری داستان رحمٰن کے گوش گذار کر چکا تو رحمٰن نے جو بظاہر نہایت دردمندانہ طریقے سے ایک ایک لفظ غور سے سُن رہا تھا آصف کی کمر پر آہستہ سے تھپکی دیتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں۔ میں ایسا اچھا علاج تجویز کروں گا کہ تم سب رنج و غم بھول جاؤ گے"۔

آصف نے حیران ہو کر پوچھا "کیسا علاج؟"

رحمٰن نے وثوق آمیز لہجے میں جواب دیا "جب تمہاری حیثیت کے ایک معزز آدمی کی توہین ایک عورت کے ہاتھوں ہو تو اُس کا انتقام ساری نسوانی دنیا سے لیا جائے گا!"

آصف نے پہلے سے بھی زیادہ حیرت کے ساتھ پوچھا "کیونکر؟"

اور رحمٰن نے پہلے سے بھی زیادہ وثوق آمیز لہجے میں جواب دیا "یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

ایک روز شام کے وقت رحمٰن آصف کے ہاں آیا۔ آصف یونہی آرام کرسی پر دراز سگریٹ کے کش لگا کر ہوا میں دھوئیں کے بادل اُڑا رہا تھا۔ رحمٰن نے کہا "میں سیر جا رہا ہوں۔ چلتے ہو؟"

آصف نے پوچھا "کس طرف جاؤ گے؟"

رحمٰن نے آصف کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اُٹھو تو سہی جس طرف کہو گے چلیں گے"

دونوں دوست ایک بارونق، فراخ اور مصفّا سڑک سے گذرتے ہوئے شہر کے ایک گنجان علاقے میں داخل ہو گئے۔ آصف نے رحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر کبیدہ خاطر ہو کر کہا "اس طرف کہاں جا رہے ہو؟ چلو واپس چلیں"

رحمٰن نے آصف کا ہاتھ تھام لیا اور بہت نرمی سے کہنے لگا "یہاں میرے ایک نہایت دلچسپ دوست رہتے ہیں۔ جن کی ملاقات تمہاری تفریح کا باعث ہو گی۔ انہی کے ہاں جا رہا ہوں"۔

آصف جو روزمرہ زندگی کے رنجدہ تسلسل سے بے حد اکتا گیا تھا، اس خیال سے کہ چلو کسی دلچسپ آدمی سے ملاقات ہو گی، خاموشی سے رحمٰن کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہا۔ بازار کا کسی قدر گنجان حصہ طے کر کے بائیں ہاتھ کو ایک بے رونق سی گلی میں گھوم کر ایک معمولی حیثیت کے مکان میں رحمٰن داخل ہو گیا

آصف اُس کے پیچھے پیچھے تھا زینے پر سے ہوتے ہوئے دونوں اوپر پہنچ گئے رحمٰن نے دستک دی تو ایک ملازم آیا۔ رحمٰن کو دیکھتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اور بہت ادب سے دونوں کو ایک صاف ستھرے، خوبصورت، آراستہ کمرے میں لے جاکر بٹھا دیا۔

آصف نے دیکھا کہ مکان باہر سے جس قدر چھوٹا اور گندا نظر آرہا تھا اُسی قدر اندر سے فراخ، صاف اور خوش وضع تھا۔ کمرے میں ہر چیز نہایت قرینہ سے رکھی تھی۔ فرش پر قیمتی قالین بچھا تھا۔ وسط میں ایک نازک سی تپائی پر خوشبودار پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ دروازوں پر کشمیر کے منقش پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر حسین و جمیل تصویریں آویزاں تھیں مخمل سے ڈھکے ہوئے آرام دہ صوفے پڑے تھے۔ ایک کونے میں پیانو پڑا تھا جس کے قریب ہی میز پر ہارمونیم بھی رکھا تھا۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کا پردہ اٹھا اور ایک خوبصورت، نوجوان، طرحدار عورت مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ رحمٰن نے تکلفاً اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔ عورت نے آصف پر ایک متجسسانہ نگاہ ڈالی تو رحمٰن نے تعارف کرانے کی غرض سے صرف اتنا کہا۔ "یہ میرے عزیز دوست آصف علی صاحب ہیں۔"

آصف نے اِس عورت کو جی بھر کے دیکھا۔ کس قدر من موہنی شکل تھی بھرا بھرا گداز جسم تھا۔ سرخ و سپید رنگت پر پوڈر کی ہلکی سی تہہ جمی تھی۔ جس سے چہرا زیادہ دمک اُٹھا تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی۔ موٹی موٹی بادامی آنکھوں سے جن پر

لمبی لمبی پلکوں کا سایہ پڑتا تھا کبھی کبھی کیف و سرور کی ایک لہر سی نکل جاتی تھی اُس نے سُرخ رنگ کے ریشم کی ڈھیلی ڈھیلی، کھلے پائنچوں کی شلوار پہن رکھی تھی گھٹنوں تک لمبی سفید ریشمی قمیص تھی اور سر پر، سر پر کیا شانوں پر، پیازی رنگ کا دوپٹہ تھا جس میں سفید مقیش ٹنکی ہوئی تھی۔ آصف کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ عورت کے جسم میں جتنی رعنائی شلوار اور قمیص سے پیدا ہوتی ہے اور کسی لباس سے ممکن نہیں۔ آج اُس نے محسوس کیا کہ وہ دلآویزی جس کا وجود اُس کے تخیل میں سالہا سال سے موجود تھا مجسم ہو کر اس عورت میں نمودار ہوئی ہے۔

رحمٰن سے چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد جب اُس عورت نے آصف کی طرف غور سے دیکھا تو آصف کو پہلی بار اُن آنکھوں کی کشش اور دلفریبی کا اندازہ ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں مقناطیسی قوت کے ساتھ اُسے آہستہ آہستہ اپنی جانب کھینچ رہی ہیں۔ کسی پُر اسرار طریقے سے اُسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ آصف نے گھبرا کر مُنہ موڑ لیا۔ لیکن اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُن آنکھوں سے نظریں نہ ہٹائے چنانچہ وہ چوری چوری اُس عورت کی طرف دیکھتا رہا۔

رحمٰن نے کہا "میرے دوست آصف صاحب موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ کیا آپ انہیں کچھ گا کر نہ سنائیں گی؟"

اُس عورت نے پھر آصف کی طرف دیکھا۔ اور بظاہر بہت شرما کے جواب

دیا۔ "اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"

وہ پیانو کے قریب آ بیٹھی اور پندرہ بیس منٹ تک گاتی رہی۔ آواز بہت ہی پیاری تھی۔ آصف کو تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاموش جادو جو پہلے اُس کی آنکھوں میں جلوہ فگن تھا۔ اب متحرک ہو کر اُس کی آواز میں لہریں لے رہا ہے۔ گانا ختم ہوا تو رحمٰن کسی بہانے سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

آصف نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ کی آواز بہت ہی دلکش ہے" اور پھر دبے الفاظ میں، گویا وہ خود نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے "آپ کی صورت آپ کی آواز سے بھی زیادہ پیاری ہے"۔

اُس عورت نے آصف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اِس ملتجیانہ انداز سے اُس کی طرف دیکھا کہ وہ اس تحریصِ ہلاکت کے سامنے بالکل بے بس ہو گیا۔ بیہوشی کی سی حالت میں وہ اپنی جگہہ سے اُٹھا اور اُس عورت کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔ کمرے کی تمام اشیاء اُس کی نظروں سے غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ بیرونی دنیا کا شور مدھم ہوتا ہوتا اب بالکل بند ہو گیا تھا۔ اُس کے قلب کی حرکت اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ تڑپتا ہوا دل شاید ابھی سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔ اُس کے اعصاب پر اُس کا ضبط و اختیار ختم ہو رہا تھا۔ صرف ایک سُرخ و صبیح، معطر و محبوب، حسین و دلآویز چہرہ، جس پر دو موٹی موٹی سیاہ، تابناک نشیلی آنکھیں دعوتِ ہلاک دینے کے لئے روشن تھیں اُس کی نظروں

کے سامنے چمک رہا تھا۔ اُس نے اُس عورت کی کمر میں اپنا دایاں بازو ڈال دیا دوسرے لمحے میں اُس کا بایاں ہاتھ بھی اُس کی گردن میں حائل ہو گیا اور پھر اُس کے لرزتے ہوئے بے تاب ہونٹ اُس عورت کے رنگین و شیریں ہونٹوں سے اپنی جوانی کے پورے التہاب کے ساتھ پیوست ہو گئے

دوسرے دن علی الصبح سورج نمودار ہوا تو آصف حسن و موسیقی کی اُس جنت سے نکلا۔ رحمٰن کا کچھ پتہ نہ تھا کہ اُسے چھوڑ کر کدھر غائب ہو گیا تھا۔ وہ جب اپنے مکان پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی والدہ اُس کے رات بھر گھر سے باہر رہنے سے سخت متفکر و پریشان ہو رہی ہے۔ آصف نے جھوٹ بول کر اُس کی تسلّی کر دی کہ اُس کو ایک دوست کی برات کے ہمراہ جانا پڑ گیا تھا۔ اپنی ماں کے سامنے ایسا قبیح جھوٹ بولتے ہوئے اُسے شرم تو ضرور آئی لیکن اُس نے سوچا کہ حقیقت کا اظہار اِس دروغِ مصلحت آمیز سے زیادہ تلخ ہو گا۔ شام کو اُس نے اپنی والدہ سے پھر جھوٹ بولا کہ جس دوست کی برات کے ساتھ وہ باہر گیا تھا آج اُسی دوست کے ہاں دعوت ہے اور شاید وہ پھر دیر سے گھر آئے۔ اُس کی والدہ نے شک و شبہ اور فکر سے ملی ہوئی نگاہیں اپنے لختِ جگر پر ڈالیں اور با دلِ ناخواستہ اجازت دے دی۔

وہ سیدھا اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا۔ شبِ گذشتہ کے واقعات کی یاد اُس کے دماغ میں تازہ ہو رہی تھی۔ اُس کے خون میں جوش اور اُس کے جذبات میں ہیجان بپا

تھا۔ یہ رات، ایسی دلفریب ایسی کامگار ایسی روشن و زرّیں رات، اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اُس مسافر کی طرح جو ریگستان میں پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کر گر پڑے اور عین اس وقت کہ جان لبوں پر آ چکی ہو اُسے کہیں سے آبِ حیات کے چند گھونٹ نصیب ہو جائیں۔ آصف بھی اپنی زندگی کے لق و دق صحرا میں بادِ سموم کے تھپیڑوں سے نیم جاں ہو چکا تھا کہ اچانک اُسے ایک چشمۂ حیواں مل گیا اور اُس کی مرجھائی ہوئی روح پھر تر و تازہ ہو گئی۔ آصف نے اپنی جوانی، اُبلتی مچلتی اور پھٹتی ہوئی جوانی، کی اوّلیں محبت اُس عورت پر نثار کر دی۔ اُس نے جس بے پناہ تندی اور جس طوفان خیز گرمجوشی کے ساتھ اس عورت سے محبت کی اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں بجلی کا پیکر ہے۔ اُس کی رگوں میں خون نہیں بلکہ آگ کے شعلے ہیں۔ خود وہ عورت بعض اوقات گھبرا جاتی تھی کہ یہ مرد جو حُسنِ سیرت و صورت میں اُس کے باقی ملنے والوں سے کہیں زیادہ پاکیزہ تھا اپنی محبت کے اظہار میں آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہولناک ہے۔

دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو کر گذر گئے۔ آصف نے جس دلدل میں پاؤں رکھا تھا اُس کے اندر دھنستا چلا گیا۔ روپیہ اُس نے پانی کی طرح بہانے میں تامّل نہیں کیا تھا۔ اپنی منظورِ نظر کی بڑی سے بڑی فرمائش کو اُس نے اس کھُلے دل سے پورا کیا کہ شاید کوئی والئی ریاست بھی اُس کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ آصف کی والدہ کو ہر بات کا علم تھا۔ اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو ڈوبتے دیکھا تو

بے قرار ہو کر اُس کو بچانے دوڑی۔ اپنے مرحوم شوہر کے دوستوں کے پاس جا جا کر
مدد طلب کی۔ جمیلہ کے والد کو خط لکھا کہ میرے بیٹے کی تباہی کا باعث آپ کا طرزِ
عمل ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اب اُس کو موت کے مُنہ سے بچانے کے لئے میری
دستگیری کریں"۔

جمیلہ کے والد کی حمیّت نے گوارا نہ کیا کہ ایک عورت کی آواز پر لبیک کہنے
سے گریز کریں۔ چنانچہ خط کا جواب دینے کی بجائے وہ خود وہاں پہنچ گئے۔ انہوں
نے دیکھا کہ آصف تعیش کے راستے پر سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑ رہا ہے
انہوں نے چاہا کہ اُسے زمانے کے نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کریں لیکن
آصف جس کی ہر حرکت سے تمسخر و استہزا کا اظہار ہوتا تھا، زبانِ حال سے کہہ رہا
تھا کہ "اگر میں تباہ ہو رہا ہوں تو میری تباہی کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر میں موت کے مُنہ
میں جا رہا ہوں تو میری ہلاکت کا سبب تم ہو، اور اگر میں گھر پھونک کر تماشا دیکھ رہا
ہوں تو میری دیوانگی کی وجہ تم ہو۔ تم نے میری پاکیزہ جوانی کے خواب کو حقیقت سے
ہمدوش نہ ہونے دیا۔ تم نے میری فرشتوں کی سی پاک و صاف محبت کی قدر نہ کی۔ تم نے
اُس معصوم و بے عیب جذبے کو، جو ہر قسم کی آلائش سے مبرّا تھا، عزّت کی نگاہ سے
نہ دیکھا اور اب کہ میں نامراد و مایوس انسان کی طرح اپنا غم غلط کرنے کے لئے ہوس کا رٗ
بن چکا ہوں، اپنی ذلت کی تلافی کرنے کی غرض سے اُس دنیا میں داخل ہو چکا
ہوں جہاں ایک عورت کے اعمال کی سزا ساری صنفِ نازک کو دے کر اپنے

نفس کی آگ کو ٹھنڈا کروں گا، تم ناصح مشفق بن کر میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کیوں آئے ہو۔؟"

آصف اُس بھنورے کی طرح جو کلی کلی کا رس چوستا پھرتا ہے اپنی تشنگی کو سیراب کرنے کے لئے جگہ جگہ چکر لگا رہا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا تھا شوقِ راہ نوردی اور تیز ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آخری منزل کہاں ہے، لیکن منزل کہیں ہو یا نہ ہو راستے کی جلوہ گاہیں قدم قدم پر اُس کے دامن کو کھینچ کر اُسے ٹھہرنے پر مجبور کر لیتی تھیں۔ اُس کی راتیں ایسے شبستانوں میں بسر ہوتی تھیں جہاں چاند کے نور، پھول کی مہک اور شاخِ گُل کی لچک نے انسان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جہاں رقص و سرود کی محفلیں آتشِ سیّال کے دَور کے ساتھ مل کر غمِ دنیا و فکرِ عاقبت کو فنا کر ڈالتی تھیں۔ اور جہاں کام و دہن کی تواضع کے لئے جام و مینا اور چشمِ نظارہ جُو کی مدارات کے لئے ساقیِ ماہ وش کا جلوہ موجود تھا۔

آصف کی تنوّع پسند اور جدّت طلب طبیعت نے عشق و ہوس کی دنیا میں فنونِ لطیفہ کے ماہر کی طرح وہ وہ رنگینیاں اور لطافتیں پیدا کیں کہ اُس کے گرد و پیش بیٹھنے والے کور ذوق، پست خیال لیکن زر پرست لوگ اُس کی اِن حرکات کو جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ بازار کی عورتوں کے ساتھ جو سہل الحصول ہونے کے علاوہ محبت کی حسِّ لطیف سے معرّا تھیں، اس رقّت آمیز شیفتگی اور نزاکت آمیز فریفتگی کا سلوک کرتا تھا۔ گویا وہ اِس غلیظ دنیا کی رہنے والی ہستیاں نہیں بلکہ زہرہ اور ناہید

کی طرح عالم بالا کی دیویاں ہیں

باغوں اور سبزہ زاروں میں جاجاکر، آبِ رواں کے کنارے اور گل و گلزار کے درمیان راگ رنگ کی محفلیں جماجماکر، مئے کہنہ و معشوقِ جواں کی صحبت میں جی کھول کر دادِ عشرت دے دے کر وہ شہر بھر کے تماشبینوں میں اپنے آپ کو یوں نمایاں کر رہا تھا جیسے باغ کے چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان سرو کا بوٹا تقابل اور تضاد کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ دولت دونوں ہاتھوں سے لٹانے میں اُسے کوئی رنج نہ ہوتا تھا بعض ادنیٰ درجے کے کم ظرف، گندہ دہن لوگ سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ ان فرومایہ انسانوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ اُسے عیّاشی کی زیادہ سے زیادہ چاٹ لگاکر اور بدچلنی کے نئے سے نئے طریقے سکھاکر روپیہ اکٹھا کریں۔ شراب وہ کثرت سے پینے لگ گیا تھا اور کوکین کے استعمال سے بھی اُسے عار نہ تھی۔

آہستہ آہستہ اُس نے ایسے خطرناک ذرائع اختیار کر لئے کہ اُس کی رسائی بازار کے بالاخانوں سے نکل کر شریف گھرانوں تک ہوگئی۔ اُس نے لوگوں کی بہو بیٹیوں کو خراب کرنا شروع کیا۔ شہر کے اندر اُس کے خلاف نفرت اور عناد کی ایک لہر پیدا ہوگئی۔ غیرت مند لوگوں نے دیکھا کہ وہ عوام کے افلاس سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر سرعت کے ساتھ نفس پرستی کی وبا پھیلا رہا ہے۔ نوجوانوں کے لئے اُس کی صحبت طاعون کے جراثیم سے بھی زیادہ مہلک تصوّر کی جانے لگی۔ لوگ اپنے بچّوں کو اُس سے دور رکھنے پر مجبور ہوگئے اور شرفاء اپنے مکانوں پر اُس کا

سایہ پڑ جائے کو اپنی توہین سمجھتے تھے

اِن حالات میں اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے خلاف ایسا خوفناک مواد تیار ہو رہا ہے کہ اگر وہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح کبھی پھٹا تو اُس کی زندگی معرضِ خطر میں آجائے گی۔ اُس کے اندر سود و زیاں کا احساس تو مر چکا تھا۔ البتہ تنقید اور تناسب کی حِس موجود تھی۔ اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ عرصے کے لئے باہر چلا جائے یوں بھی اُس کا ماحول اب ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح متعفن ہو گیا تھا۔ وہ اپنے جذبات کی چنگاری کو روشن رکھنے کے لئے تیز و تُند ہوا کا محتاج تھا۔ اُس نے دیکھا کہ تیز و تُند ہوا کے جھونکے اُس کے ہاں ختم ہو چکے ہیں۔ وہ آندھی کی تلاش میں گھر سے نکل کر سیدھا دہلی گیا۔ دہلی سے لکھنؤ۔ لکھنؤ سے بنارس، بنارس سے کلکتے، اور کلکتے سے بمبئی۔ اِس طرح وہ دو سال تک ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھانتا رہا۔ جب واپس گھر آیا تو اُس کا دل بُجھا ہوا، دماغ تھکا ہوا، اور جسم کچلا ہوا تھا

چھ مہینے وہ اپنے مکان سے باہر نہ نکلا۔ جب جسم میں سکون پیدا ہوا تو دماغ میں حرکت شروع ہو گئی۔ جب خمار اُتر گیا تو حقیقت کی تلخیاں ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ صبح سے شام تک اب اس کا یہ کام تھا کہ خود تو چارپائی یا کرسی پر دراز ہے اور دماغ ماضی کے محاسبے، حال کے تجزیے اور مستقبل کے اندیشے میں مصروف ہے۔ اُس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ زندگی کی

دلچسپیاں ایک ایک کر کے ختم ہو چکی تھیں۔ دنیا کی رنگینیوں سے وہ جی بھر کر لطف اندوز ہو اتھا۔ اب اُس کے لئے باقی رہ گیا گیا تھا۔ اس ہر گھڑی بدلتے رہنے والی کائنات میں اُس کے لئے کوئی چیز نئی نہ تھی، کوئی تغیّر ایسا نہ تھا جو اُس کے دماغ میں تفحص یا اُس کی نظر میں جستجو کی تحریک پیدا کرے۔ وہ بے رونق تھکی ہوئی پژمردہ نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا اور اُسے ہر جگہ حزن و ملال اور رنج و بیکسی کی ڈراؤنی تصویریں نظر آتی تھیں

وہ اپنا زمانۂ تعیش ختم کر چکا تھا۔ اور اب اُسے یہی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا نے سوگ کا لباس پہن لیا ہے۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی، اس مسلسل تکلیف دہ اور ہر لمحہ دل کے زخموں کو ہرا کرنے والی تنہائی سے اگر وہ اُکتا بھی جاتا تو اُس کے لئے سوائے اِس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خاموشی سے قدرت کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دے۔ اُس کا شادی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ بعض اوقات خود ہی اپنے آپ سے سوال کرتا "کیا میں شادی کر لوں؟ کیا میں اِس قابل ہوں کہ ایک پاکدامن، بے لوث اور عفت مآب دوشیزہ کے روبرو اپنی گناہوں سے آلودہ روح اور اپنا سیاہ کاریوں سے ملوث دل ہدیتہً پیش کر سکوں؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ ایک بھولی بھالی، انجان، ناتجربہ کار، معصوم لڑکی کو اپنی شریکِ زندگی بنا لوں درحالیکہ میرا جسم خوفناک اور مکروہ امراض سے جذام کے مریض کی طرح گھناؤنا ہو چکا ہے؟ کیا میں ایسی بیوی کے سامنے جس کی پاکیزگی اور جس کے تقدس کو دیکھ کر حوریں بھی شرما جائیں سربلند و مطمئن رہ سکوں گا؟ کیا یہ فعل

میری بد اعمالیوں، فریب کاریوں اور ہوسناکیوں کی طویل فہرست میں ایک قابلِ نفرت اضافہ نہ کرے گا؟"

ایک شام جب وہ معمول سے زیادہ افسردہ اور غمناک اپنے پُرتکلّف آراستہ کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا اُس کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے قدِآدم آئینے پر پڑ گئی۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے رُکا پھر جیسے خود ہی اُس کی طرف کھنچا چلا جائے۔ وہ آئینے کی جانب بڑھتا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر جا بجا چھوٹے چھوٹے دھبّے پڑے ہیں۔ اُس کی سُرخ وحشت ناک آنکھیں جن کے گرد حلقے موجود ہیں باہر کی طرف اُبلی پڑتی ہیں۔ اُس کی رنگت سیاہ ہو گئی ہے اُس کی پیشانی پر اور ناک کے دونوں طرف شکن اور جھرّیاں نمایاں ہو رہی ہیں اُس کے گال اندر کی طرف پچکے ہوئے ہیں اور مجموعی طور پر اُس کی شکل وصورت سے خباثت ٹپک رہی ہے۔

وہ گھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ دفعتہً غیر ارادی طور پر اُس کی نظریں ساتھ ہی دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر پر جم گئیں، یہ تصویر خود اُسی کے عنفوانِ شباب کی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اِس تصویر میں وہ ایک بھولا بھالا، خوبصورت، دلکش نوجوان ہے جس کے چہرے پر معصومیت کا نور برس رہا ہے۔ آنکھوں میں حیا کی چمک روشن ہے اور پیشانی سے بلند اقبالی کا ستارہ طلوع ہو رہا ہے۔ وہ ماضی اور حال کے اِس زندہ تضاد کو دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ اور اسی آئینے میں، اُسی ایک لمحے

کے اندر اُس نے مستقبل کی اس سے بھی زیادہ قبیح، اس سے بھی زیادہ شرمناک اس سے بھی زیادہ مکروہ جھلک دیکھ لی کہ اُس کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، دانت گر گئے ہیں۔ کمر جھک گئی ہے۔ اور وہ ایک قدم اٹھانے کے لئے دوسروں کی امداد کا محتاج ہے

اِس تصوّر کے ساتھ ہی وہ ایک ناتواں بے جان پیکر کی طرح دھڑام سے ایک صوفے پر گر گیا۔ پریشان، جاں گداز، روح فرسا خیالات کی بے پناہ یورش سے اُس کا دماغ تھرتھرانے لگا۔ "کیا وہ بوڑھا ہو جائے گا؟ کیا وہ اپاہج انسانوں کی طرح جھکی ہوئی کمر، رعشے سے کانپتی ہوئی ٹانگوں اور ضعف سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہاتھ میں لاٹھی لے کر چلے گا؟ کیا بچّے اُسے دیکھ دیکھ ہنسیں گے اور جوان اُس سے نفرت کریں گے؟ کیا عورتیں اُس کی طرف اشارے کر کر کے اُس کی گذشتہ زندگی کی داستانیں بیان کریں گی؟ نہیں نہیں۔ وہ کبھی بوڑھا نہیں ہو گا۔ وہ ہمیشہ جوان رہے گا۔ وہ پیری کی مصیبت اور بڑھاپے کی لعنت کو کبھی اپنے اوپر مسلّط نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنے وجود کو اپنے لئے اِس قدر بوجھل، اِس قدر تلخ اور اس قدر گرانبار نہیں بننے دے گا۔ وہ زندگی بھر جوان رہا۔ اور جوان ہی دنیا سے رخصت ہو گا۔"

دوسرے دن علی الصبح ملازم ناشتہ لے کر اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا آقا اوندھے مُنہ پلنگ پر پڑا ہے۔ بستر خون سے

لت پت ہو رہا ہے۔ اُس کی شہ رگ کٹی ہوئی ہے اور قریب ہی بڑا سا تیز خنجر رکھا ہے

الف لیلہ کی ایک رات

الف لیلہ کی ایک رات

اس مرتبہ بمبئی میں ناصر کے ہاں جو شام گزری وہ بھی ایک یادگار واقعہ رہے گا۔ ناصر کو پنجاب سے گئے پورے پندرہ سال گزر چکے تھے۔ شروع شروع میں ہم نے یونہی اُڑتی ہوئی خبر سُنی تھی کہ وہ بمبئی میں ہے۔ لیکن چونکہ نامہ وپیام کا سلسلہ بالکل بند تھا۔ اِس لئے اُس کے حالات پر ہمیشہ گمنامی کا پردہ پڑا رہا۔

اب کی میں بمبئی گیا تو ناصر کا خیال تک ذہن میں نہ تھا۔ آٹھ دس روز کام میں مصروف رہنے کے بعد جب فراغت ملی تو بمبئی کی سیر کا شوق چرایا۔ باندرہ، دادر اندھیری، ورلی، جوہو، ماہم مضافاتِ بمبئی کے خوبصورت حصوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ شہر میں مالابارہل کولابا، چوپاٹی، اپالو اپنی دلکشی کے اعتبار سے قابلِ دید مقامات ہیں۔ چرچ ریکلیمشن میں سمندر کے کنارے چند سال ہوئے ایک بہت مضبوط بند تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ جگہ بے حد صاف، خوشگوار اور پُر رونق ہے۔ ایک طرف سمندر اپنی بے پایاں وسعت کے ساتھ پھیلا ہوا دُور اُفق سے جاملتا ہے اور دوسری طرف سڑک کے اُس پار بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے عالی شان مکانات کی ایک حسین وجمیل قطار کھڑی ہے۔ شام کے وقت رنگ برنگ روشنیوں سے جھلمل جھلمل کرتے ہوئے مکانوں کا یہ سلسلہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا

عروسِ بمبئی کی گردن میں کسی نے موتیوں کا ہار پہنا دیا ہے

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے یہاں کی شام میں پہلی سی چہل پہل نہیں رہی۔ ہوائی حملے سے بچنے کے لئے سڑک پر بجلی کی روشنی بہت مدھم کر دی گئی ہے۔ اِس لئے سیر کو لوگ کم آتے ہیں۔ سُنا ہے پہلے یہ حالت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ میں بھی ایک شام گھومنے کے لئے یہاں چلا آیا۔ میرے ہمراہ میرے میزبان شوکت بھی تھے۔ شوکت کے ہاں میرا قیام تھا اور وہی بمبئی میں میرے رہبر تھے۔ ہم ساحلِ سمندر کا ایک بہت لمبا چکر کاٹ کر اب پتھروں سے بنی ہوئی مضبوط دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سڑک پر گزرنے والے لوگوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

سامنے دریچوں پر لٹکے ہوئے ریشمی پردے سمندر کی ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے تھے۔ اور ان پردوں کے پیچھے عیش و مسرت کے کارخانے جاری تھے۔ ہر مکاں سے نغمہ و سرود کی تانیں بلند ہو رہی تھیں۔ شوکت کہہ رہے تھے کہ ان مکانوں میں بمبئی کے خوشحال اور مالدار لوگ رہتے ہیں۔

ہمیں وہاں کھڑے پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ سامنے سے ناصر گزرا۔ اتفاق سے اُس نے مجھے دیکھ لیا اور ہم فوراً پہچان کر بغلگیر ہو گئے۔ اگرچہ ہمیں جدا ہوئے پندرہ سال گزر گئے تھے۔ لیکن ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی تھی۔ ناصر کی شکل و صورت میں بہت تھوڑی تبدیلی ہوئی تھی۔ اور اُس کا بیان تھا کہ مجھ میں بھی بہت کم فرق آیا ہے۔ ناصر نے چھوٹتے ہی دریافت کیا کہ ہیں کب

سے بمبئی میں ہوں اور کہاں ٹھہرا ہوں
میں نے شوکت کی طرف اشارہ کرکے جواب دیا کہ "یہ میرے دوست ہیں اور انہی کے مکان پر میرا قیام ہے"۔
پھر میں نے ناصر اور شوکت کا تعارف کرایا
اب ناصر نے اصرار شروع کیا کہ ہم اُس کے ہمراہ چلیں اور رات کا کھانا بھی کے ہاں کھائیں۔ اُس نے دہنا ہاتھ بڑھا کر سامنے اشارہ کرکے کہا کہ "وہ دیکھو اس قطار کا آٹھواں مکان۔ جہاں نیلگوں روشنی نظر آتی ہے۔ وہیں میں رہتا ہوں۔ ایک منٹ کا راستہ ہے۔ آؤ چلیں"۔
یہ کہہ کر اُس نے پُرانے بے تکلفی کے انداز میں میرا بازو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا میں شوکت کی طرف دیکھ کر مُسکرایا اور ناصر سے کہا کہ "دیکھو، شوکت صاحب میرے میزبان ہیں۔ ان کی اجازت ضروری ہے۔ ہم تمہارے ہاں چلیں گے لیکن کھانا کسی اور وقت پر اُٹھا رکھو"۔
شوکت نے بھی معذرت کے طور پر کہا کہ "آپ کی ملاقات سے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے لیکن ایک ضروری کام کی وجہ سے آج ہمیں جلد واپس جانا ہے اس لئے کھانے کو پھر کسی وقت کے لئے ملتوی کر دیجئے۔ یوں ہم آپ کے دولت خانے تک چلے چلتے ہیں"۔
سامنے عظیم الشان مکانات میں رہنے کا مطلب تھا کہ ناصر خود بھی یقیناً

اُسی مالدار طبقے کا ایک رُکن ہو گا جو اس جگہہ آباد تھا۔ میں ناصر کے ماضی سے واقف تھا اور اب کہ ہم ذرا جلدی جلدی اُس کے مکان کی طرف قدم بڑھا رہے تھے ناصر کی آج سے پندرہ برس پہلے کی زندگی کا نقشہ ہو بہو میرے دماغ میں گھومنے لگا تھا۔ لاہور کی تنگ و تاریک گلی میں چھوٹا سا قفس نما مکان میری آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ جہاں سے ناصر میلے کچیلے کپڑے پہن کر ہر روز اسکول آیا کرتا تھا۔ پھر اسکول میں جو عجیب و غریب بہانے کر کر کے وہ پڑھائی سے بھاگتا اور جس جس قسم کی شرارتوں سے ماسٹروں کا ناک میں دم کر دیتا تھا وہ سب کچھ معاً مجھے یاد آگیا تھا اور یہ تمام باتیں یاد آتے ہی خود بخود میرے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔ ناصر اس دوران میں مجھ سے سوالات کئے جا رہا تھا کہ میں کب بمبئی آیا۔ کس غرض سے آیا۔ کب تک ٹھہروں گا۔

اتنے میں ناصر کا مکان آگیا۔ دروازے پر پٹھان پہریدار کھڑا تھا۔ گراج میں موٹر تھی اور اوپر ولائتی فرنیچر، ایرانی قالین اور بیش قیمت سامان سے سجے ہوئے کمرے جگ مگ کر رہے تھے۔ یہ رنگ روغن دیکھ لینے کے بعد ناصر کی موجودہ حیثیت کا اندازہ لگانے میں دقت نہ ہوتی تھی۔ ہم پندرہ، ایک منٹ ٹھہرے اور پھر دوسری شب کھانے میں شریک ہونے کا وعدہ کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔

لاہور سے ناصر کا یکایک غائب ہو جانا اُس کے اسکول کے چند دوستوں

کے لئے بھی چنداں اہم واقعہ نہ تھا کہ اُس پر زیادہ غور و فکر کیا جاتا۔ ناصر کی حقیقی والدہ فوت ہو چکی تھیں اور سوتیلی ماں کے سلوک سے وہ ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ باپ منیاری کی ایک معمولی سی دُکان کرتا تھا اور تھوڑی آمدنی کی وجہ سے بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ سوتیلی والدہ کے اپنے بچّے تھے اور باپ کی ساری محبّت اُنہی کی طرف چلی گئی تھی۔ اِس لئے ناصر ہر وقت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ اُس کا اسکول جانا بھی اُس کی ماں کو گوارا نہ تھا۔ رو پیٹ کر وہ ہر مہینے فیس تو لے لیتا تھا لیکن اگر کبھی قلم، دوات، کاپی یا کتاب خریدنے کی ضرورت آپڑتی تو اُس کے گھر میں باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی تھی اور بے چارہ ناصر گالیوں اور طعنوں سے بُری طرح پیسا جاتا تھا۔ اِس پر طرّہ یہ کہ ناصر کو خود بھی پڑھائی کا شوق نہیں تھا۔ اسکول میں شرارتیں کرتے رہنا اُس کا محبوب کام تھا اور اسی مشغلہ کے لئے وہ ہر روز اسکول بھی آتا تھا۔ آخر ایک دن یہ ہوا کہ ناصر چپکے سے کہیں غائب ہو گیا۔ اُس کے والد نے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کی لیکن لڑکا نہ ملا۔ اُنہوں نے تھانے میں رپٹ لکھوا دی اور گھر بیٹھ گئے۔ ناصر کی سوتیلی والدہ نے بظاہر کچھ تردّد کا اظہار کیا لیکن درپردہ وہ خوش تھی کہ یہ کانٹا نکل گیا

پندرہ سال ناصر گُم رہا۔ لاہور میں کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ آج اِتنی طویل مدّت کے بعد زمانے کی گردش نے مجھے اسکول کے اُسی کھلنڈرے لڑکے سے بمبئی میں پھر ملا دیا لیکن کس قدر بدلے ہوئے حالات میں

اب وہ ایک امیر آدمی کی طرح بڑے ٹھاٹھ سے بمبئی کے پُرتکلف حصے میں جہاں گردوپیش رؤسا کی آبادی تھی رہتا تھا۔ اُس کا شاندار مکان اور اُس کے رہنے سہنے کے طریقے اُس کی بلند حیثیت کی شہادت دینے کو کافی تھے۔

دوسرے دن شام کو ہم نے ناصر کے ہاں کھانا کھایا اور کھانے کے بعد رات کے بارہ بجے تک شوکت اور میں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے درمیان جو حیرت انگیز گفتگو ہوئی اُس نے اُس شام کو ایک دلچسپ اور پُراسرار جامہ پہنا دیا ہے۔ ناصر کی بیوی بھی کھانے میں شریک ہوئیں۔ یہ بہت خوبصورت اور مہذب خاتون تھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ چلی گئیں تو ہم نے باتیں شروع کیں۔ میں نے ناصر سے کہا کہ "کس قدر عجیب بات ہے کہ تم بمبئی میں اتنی اچھی زندگی بسر کر رہے ہو اور لاہور میں کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ناصر زندہ ہے یا مر گیا۔"

ناصر نے ہنس کر جواب دیا "پندرہ سال ہوئے میں نے لاہور کی صورت نہیں دیکھی، لاہور کی یاد میرے لئے چنداں خوشگوار نہیں ہے۔ یہاں کوئی شخص نہیں جانتا کہ میں پنجاب کا باشندہ ہوں۔ اِس کے علاوہ میں نے بمبئی میں آتے ہی اپنا نام بدل دیا تھا۔ اب میرا نام حیدر ہے۔ تم مجھ کو ناصر کے نام سے پکارتے ہو تو گذشتہ زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا "تو کیا تم یہاں حیدر کے نام سے مشہور ہو۔ ناصر کو کوئی نہیں جانتا؟"

ناصر نے مسکرا کر کہا۔ ناصر سے کوئی شخص آشنا تک نہیں۔ ہاں حیدر سے بمبئی کا بہت بڑا حصّہ واقف ہے۔"

میں نے پوچھا "نام بدلنے کی کیا وجہ تھی؟"

ناصر نے کہا "یہ بھی ایک داستان ہے۔"

میں نے کہا "بھائی، جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے تم تو ایک مجسّم افسانہ معلوم ہو رہے ہو۔ لاہور سے تم کس حال میں آئے اور اب خدا نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ یہ ایک داستان نہیں تو کیا ہے۔ تمہاری موجودہ حیثیت دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں تمہاری زندگی کی مختصر رُوئداد سننے کے لئے بے تاب ہوں۔ کیا تم مہربانی کر کے اپنے گذشتہ پندرہ سال کے واقعات سے پردہ اُٹھا سکتے ہو؟"

ناصر نے شوکت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ آپ سے مجھ کو زیادہ واقفیت کا شرف حاصل نہیں ورنہ تمہارے سامنے یہ قصّہ بیان کرنے سے تو میں نہیں گھبراتا

میں نے کہا "شوکت کو میرا بھائی سمجھو۔ مجھ سے زیادہ قابلِ اعتماد دوست ہیں۔"

ناصر نے کہا "تو پھر سنو۔ شروع سے بیان کئے دیتا ہوں۔ میں جب لاہور سے چلا تو میری جیب میں دس روپے تھے۔ اُس زمانے کی حالت تم جانتے

ہی ہو۔ میں پیسے پیسے کو ترستا تھا۔ یہ دس روپے حاصل کرنے میں میں نے بڑی جدوجہد کی۔ پورے چھ مہینے اس کوشش میں لگ گئے۔ آخر میں نے یہ رقم حاصل کر ہی لی۔ میری والدہ ہمیشہ اپنے ٹرنک میں روپوں کی تھیلی رکھتی تھی اور ٹرنک کی چابی بھی اُسی کے پاس رہتی تھی۔ میں نے ویسی ہی چابی بازار سے بنوائی اور ایک روز وہ سو رہی تھی تو میں نے ٹرنک کھول کر روپے نکال لئے۔ اُسی رات گاڑی میں سوار ہو کر میں دہلی بھاگ گیا۔ میرا خیال تھا کہ دہلی بڑا شہر ہے وہاں روزگار مل جائے گا۔ دہلی پہنچ کر میری جیب میں پانچ روپے بچے۔ چند روز میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا ہر چند کام تلاش کیا لیکن کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ میں ایک روز غمگین ہو کر بازار میں کھڑا تھا کہ ایک اچھے خوش پوش راہ گیر ملے۔ اُنہوں نے غالباً میری صُورت سے میری بے کسی بھانپ لی اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ میں اُردو پڑھ لکھ سکتا ہوں تو وہ مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار کے مالک تھے اپنے دفتر میں اُنہوں نے مجھے چپراسی مقرر کر دیا۔ اس طرح میں وہاں رہنے لگا۔ کھانا بھی وہیں سے مل جاتا تھا

آہستہ آہستہ مجھے اخبار بینی کا شوق ہو گیا۔ دنیا جہاں کی خبریں پڑھتا تھا تو میرے دل میں ولولہ اُٹھتا تھا کہ شہروں اور ملکوں کی سیر کروں۔ کلکتہ اور بمبئی کے حالات سے مجھے بہت دلچسپی ہو گئی تھی۔ اخبار کے دفتر میں ایک شخص کام کرتا تھا جو کچھ عرصہ بمبئی میں بھی رہ چکا تھا۔ میں اکثر اُس کے پاس بیٹھ کر بمبئی کی باتیں سنتا تھا۔ سمندر میں

چلنے والے جہاز اور بادبانی کشتیاں میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی تھیں۔ اونچی اونچی سربفلک عمارتیں، وسیع خوبصورت سڑکیں اور انسانوں کے ہجوم سے بھرے ہوئے بازار ہر وقت میری نظروں کے روبرو گھومتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ بمبئی چلا جاؤں۔ اِس نیّت سے میں نے اپنے خرچ میں اور بھی تخفیف کر دی اور ہر مہینے تنخواہ میں سے زیادہ رقم بچانے لگا۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے پاس اتنے روپے ہو گئے ہیں کہ بمبئی میں چند روز گزر جائیں گے تو میں نے دہلی کو خدا حافظ کہہ دیا۔ ریل کے اسٹیشن سے باہر نکل کر جب میں نے بمبئی کی پہلی سڑک پر قدم رکھا تو گاڑیوں، موٹروں کی کثرت راہ گیروں کے اژدحام ٹریم کے شور اور دائیں بائیں دونوں طرف بلند عمارتوں کی قطاریں دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا گویا میں کوئیں کے ساکن پانی سے نکل کر سمندر کی طغیانی میں داخل ہو گیا ہوں۔ بمبئی میں میری واقفیت بالکل نہیں تھی۔ اس لئے میرے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ اپنے ٹھہرنے کا کیا انتظام کروں۔ ایک شخص نے مجھ کو بتایا کہ یہاں ایک مسافرخانہ ہے جہاں تین روز تک آدمی مفت قیام کر سکتا ہے۔ میں پتہ پوچھتا پوچھتا مسافرخانہ میں پہنچ گیا۔ جگہ اچھی تھی لیکن افسوس ہے کہ قاعدے کے مطابق مجھے وہاں تین روز سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ ان تین دنوں میں میرا یہ معمول تھا کہ رات مسافرخانے میں بسر ہوتی تھی اور دن بھر صبح سے شام تک میں ادھر اُدھر پھرتا رہتا تھا۔ سیر کے ساتھ ساتھ میں اس کوشش میں بھی تھا کہ کہیں روزگار کی صورت نکل آئے۔

بمبئی میں غریبی اور امیری کی انتہائی مثالیں موجود ہیں محلوں میں رہنے والے بھی بہ کثرت ہیں اور ایسے لوگ بھی بے شمار ہیں جو رات کو سڑک کے دونوں طرف پیدل چلنے والی پٹڑی پر آ کر سو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے پاس بستر ہوتا ہے اور بعض بستر کے بغیر ہی پتھر کے تکیئے پر سر رکھ کر رات گذار لیتے ہیں۔ مسافر خانے سے نکل کر مجھے بظاہر اس کے سوا اور کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی کہ رات "فٹ پاتھ" پر بسر کروں۔ جی گھبراتا تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ کرافورڈ مارکٹ کے پاس سڑک کے کنارے میں نے اپنے لئے جگہ تلاش کی۔ شام ہی سے قسم قسم کے لوگ یہاں آ کر ڈیرہ جما دیتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا ٹرنک میرے ہمراہ تھا۔ اس کو میں نے سرہانے کی جانب تکیے کی جگہ رکھ لیا اور بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ عجیب منظر تھا۔ سامنے سڑک پر گاڑیوں کے چلنے اور راہ گیروں کی آمد و رفت سے ایک شور سا تھا۔ اوپر آسمان کی نیلگوں چھت کا سایہ تھا اور فرشِ زمین پر میں لیٹا ہوا خدا کی قدرت پر غور کر رہا تھا۔ چونکہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ اس لئے دل میں اضطراب طاری تھا۔ نیند نہیں آتی تھی۔ بارہ بجے تک میری آنکھیں کھلی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ میں سو گیا

یکایک مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ میں بولنا چاہتا ہوں لیکن حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ میں ایک کپکپی کے ساتھ جاگ اُٹھا میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور جسم پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ اب بھی میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ میرا گلا بُری طرح دبایا جا رہا ہے اور حواس جواب دے رہے ہیں۔ میں اٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے ہاتھ جنبش نہیں کرتے تھے۔

میرے دل کے کسی گوشے سے کانپتی ہوئی آواز آرہی تھی کہ موت کا وقت قریب ہے۔ میں نے پوری کوشش کے ساتھ، گویا میں کسی پہلوان کے ساتھ زور آزمائی کر رہا ہوں، اپنے اوپر سے چادر ہٹا دی مجھ سے بمشکل دو، چار فٹ کے فاصلے پر ایک شخص سو رہا تھا، اُس کا چہرہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن آنکھوں کے قریب چادر میں ایک سوراخ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اِس سوراخ میں سے دو آنکھیں میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ میں نے پوری طاقت سے بولنے کی کوشش کی۔ لیکن میری زبان کو الفاظ کا یارا نہ تھا صرف میرے حلق سے اُس بچے کی طرح جو سوتے میں ڈر کر چیخ مار دیتا ہے ایک خوفناک سی آواز نکل سکی۔ اب میں نے آخری مرتبہ نیم بیہوشی کے عالم میں پوری قوت کے ساتھ اپنے جسم کو جھٹکا دیا۔ میں اُٹھ بیٹھا تھا اور دوسرے ہی لمحہ میں میں نے اُس قریب لیٹے ہوئے آدمی کو دبوچ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سارا فساد اُن دو آنکھوں نے پیدا کیا تھا جو چادر کے سوراخ میں سے ٹکٹکی باندھے مجھ کو گھور رہی تھیں۔ یکایک غائب ہو جانے والی طاقت دوبارہ میرے جسم میں لوٹ آئی تھی۔ میں نے اُس آدمی کو پکڑ کر بُری طرح جھنجوڑا اور بہت تلخ آواز میں اُس کو گالیاں دیں۔ وہ ایک عرب تھا، اِس کشمکش میں وہ بھی بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شور سُن کر پولیس کا پہریدار بھی لپک کر ہماری طرف آگیا۔ میرے پاس جھگڑے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ جس سے میں سنتری کو قائل کر سکتا۔ میں نے صرف یہی کہا کہ "یہ شخص کوئی جادوگر ہے۔ اور مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے"۔

عرب نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں جواب دیا "بابا ہم تو مسافر لوگ ہے ہم کیوں کسی کو مارے گا۔"

میں نے سنتری کو پوری واردات سنائی تو اُس نے صرف یہی کیا کہ عرب سے کہہ دیا کہ وہاں سے ہٹ کر کسی اور جگہ سو جائے۔ عرب وہاں سے کھسک گیا اور میں ہانپتا کانپتا دوبارہ اُسی جگہ لیٹ گیا

تمام رات میری آنکھوں سے نیند غائب رہی۔ صبح ہوئی اور سورج کی روشنی نے کائنات کو نئی زندگی عطا کی تو میں نے محسوس کیا گویا مُردوں کی دنیا سے نکل کر دوبارہ زندوں کی دنیا میں آیا ہوں۔ کئی روز تک اِس واقعہ کا اثر میرے دل و دماغ پر رہا۔ کبھی کبھی میں اِس سارے قصّے کو خواب سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا لیکن اُس رات کے نقوش اِس شدّت سے میرے حافظے پر ثبت ہو چکے تھے کہ ہزار تاویلوں کے باوجود میں اِس واقعہ کو خواب سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ واپس دہلی چلا جاؤں لیکن بہت سا روپیہ کرائے پر خرچ ہو چکا تھا اور اب واپس جانا محال نظر آتا تھا۔ اس دوران میں مجھے ایک اخبار کے دفتر میں چپراسی کی جگہ مل گئی لیکن وہ شگفتگی جو بمبئی پہنچ کر طبیعت میں پیدا ہوئی تھی مفقود ہو گئی تھی۔ اب تو میں اسی فکر میں تھا کہ کچھ روپیہ جمع کر کے دہلی بھاگ جاؤں۔ اتنے میں ایک روز چھٹی کے دن شام کو میں اپالو پر کھڑا تھا کہ وہی عرب میرے پاس سے گزرا۔ میرے حافظے نے فوراً کہا کہ یہ وہی شخص

ہے۔ خوف سے مجھ پر رعشہ طاری ہو چلا تھا لیکن میں نے ضبط قائم رکھا۔ عرب نے گھور کر میری طرف دیکھا اور پھر اُس کے چہرے پر جان پہچان کے آثار پیدا ہو گئے۔ اُس نے مسکرا کر اپنا ہاتھ پیشانی پر لا کر مجھے سلام کیا۔ و یسے تو میں نے اُس کے سلام کا جواب دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اُس سے منہ پھیر لینا چاہتا تھا۔

اُس نے کہا "یا عزیز، ہم کئی دن سے آپ کو تلاش کرتا تھا۔ آپ کدھر رہا۔ آؤ کچھ باتیں کریں"۔

میں نے غصّے سے بے تاب ہو کر کہا "بکواس مت کرو اور اپنا راستہ لو"

اُس نے پھر کہا "واللہ باللہ۔ ہم آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔ پانچ منٹ کے لئے سامنے ریسٹوران میں آؤ اور ہمارے ساتھ چائے پیو"۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کس جذبے کے ماتحت میں نے اُس کی دعوت قبول کر لی۔ ہم نے ریسٹوران میں چائے پی اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مجھے ہر گھڑی اندیشہ تھا کہ شاید وہ پھر اپنے پُر اسرار کرتب دکھائے گا۔ میں تیار تھا کہ جونہی اُس نے ایسی حرکت کی میں بلا تامّل اُس پر حملہ کر دوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ہمارے درمیان ایک قسم کی دوستی قائم ہو چکی تھی۔ اُس کے بعد یہ عرب صرف ایک مرتبہ مجھ سے

ملا۔ وہ مسمریزم کا ایک خطرناک عامل تھا۔ اُس کا دعوےٰ تھا کہ جو شکار اُس کے جال میں پھنسا ہے بچ کر نہیں نکلا۔ صرف میں ہی تھا جو اُس رات اُس کے سحر کو شکست دینے میں کامیاب ہوا تھا۔ اُس کے پاس بیس ہزار روپیہ جمع تھا یہ دولت غالباً اُس نے انہی ہتھکنڈوں سے پیدا کی تھی۔ تمام روپیہ اُس نے میرے حوالے کردیا اور خود کہیں غائب ہو گیا۔ میرا خیال ہے شاید وہ ہندوستان سے باہر چلا گیا ہے۔"

بہت رات گئے میں اور شوکت ناصر کے مکان سے نکلے۔ میں نے راستے میں شوکت سے پوچھا "ناصر کی سرگزشت کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

اُس نے ہنس کر کہا:۔ "جدید الف لیلہ کی ایک رات۔"

سرّ دلبراں

سرِّ دلبراں

اتوار کا دن تھا اور حفیظ، یعقوب، ناصر حسبِ معمول سرفراز کے مکان پر جمع تھے شروع سے یہی قاعدہ چلا آرہا تھا کہ چھٹی کے روز دوستوں کی مجلس سرفراز کے مکان پر جمتی۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر آئے تھے اور اب سہ پہر کی چائے کا تقاضا کر رہے تھے پہلے تو سرفراز بھی ٹال مٹول کرتا رہا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ فرار کی تمام راہیں بند ہیں تو مجبوراً ملازم کو مٹھائی لانے کے لئے بازار روانہ کیا اور اندر گھر میں چائے کے لئے کہلا بھیجا۔ تاش کی پے بہ پے کئی بازیاں ختم کرنے کے بعد اب یہ چاروں دوست چھوٹی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ فقرے چُست ہو رہے تھے اور پھبتیاں کسی جا رہی تھیں

بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں یعقوب اِن سب میں بڑھا ہوا تھا۔ اُس نے بی اے کے بعد بیمے کا کام شروع کر دیا تھا جہاں اُس کی ذہانت اور قابلیت نے اُس کی آئندہ ترقی کے بہت سے دروازے کھول دیئے تھے۔ حفیظ کا اصلی وطن کرنال تھا لیکن اُس کے والد کی ملازمت کا سارا زمانہ لاہور میں بسر ہوا تھا۔ یہیں انہوں نے مکان بنا لیا تھا اور پنشن لینے کے بعد بود و باش بھی اس جگہ اختیار کر لی تھی۔ حفیظ کو تعلیم ختم کرنے پر لاٹ صاحب کے دفتر میں ایک معقول اسامی مل گئی تھی اور اب وہ اپنے کنبے کے دیگر افراد کے ہمراہ لاہور میں رہتا تھا۔ ناصر سیالکوٹ کا

رہنے والا تھا۔ لیکن گزشتہ آٹھ سال سے لاہور ہی میں مقیم تھا۔ اُس نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور اب یونیورسٹی میں "ریسرچ سکالر" کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جس کا اُسے اچھا خاصا مشاہرہ مل جاتا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ اگر وہ اپنے موجودہ فرائض محنت و سرگرمی سے ادا کرتا رہا تو مستقبل قریب میں اُسے محکمۂ تعلیم میں ضرور کوئی قابلِ عزت جگہ مل جائے گی۔

اِن احباب میں صرف سرفراز لاہور کا اصلی باشندہ تھا۔ سرفراز کے والد لکڑی کی تجارت کرتے تھے۔ اور لاہور کے صاحبِ ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے پہلے وہ دہلی دروازے کے اندر اپنے جدّی مکان میں رہتے تھے۔ لیکن کچھ عرصے سے اُنہوں نے شہر سے باہر ایک وسیع خوبصورت بنگلہ تعمیر کرا لیا تھا۔ جہاں اب وہ اہل و عیال سمیت منتقل ہو گئے تھے۔

سرفراز نے بی اے کے بعد باپ کے کاروبار میں شریک ہونے کی بجائے قانون کی تعلیم حاصل کرنا پسند کیا اور اب اُسے پریکٹس جاری کئے ہوئے دو سال کے قریب گذر چکے تھے۔ ایک تو وکالت کا پیشہ یوں بھی کچھ ایسا نفع بخش نہیں رہا اور پھر لاہور ایسے شہر میں جہاں ہر قسم کے چھوٹے بڑے وکلا کی کثرت نے کام کو اور زیادہ محدود کر دیا ہے۔ ایک بتدی کے لئے روزگار مہیا کر لینا بے حد مشکل ہو گیا ہے کاروبار کی اِس واماندگی سے سرفراز چنداں مایوس نہیں ہوا تھا۔ اُسے کھانے پینے اور رہنے سہنے کی تمام ضروریات میسّر تھیں اس لئے اطمینان سے اپنے کام میں

محنت کئے جانے سے اُسے گریز نہ تھا اُس نے کوٹھی کے دو بڑے کمرے اپنے لئے الگ کر لئے تھے۔ ایک میں اُس کا دفتر تھا اور دوسرا نشستگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا دوست احباب آتے اور یہیں فرصت اور تفریح کا وقت گزرتا تھا

اتنے میں چائے آگئی اور سب دوستوں نے بڑھ بڑھ کر مٹھائی پر ہاتھ مارنا شروع کئے۔ باتیں بھی جاری رہیں۔ حفیظ کہنے لگا "لاہور میں اچھی مٹھائی دِلی والے حلوائی بناتے ہیں"۔

یعقوب بولا "تم مٹھائی کا ذکر کرتے ہو میں کہتا ہوں لاہور کی ہر اچھی چیز باہر والوں کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے"۔

حفیظ اور ناصر نے مسکرا کر سرفراز کی طرف دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ یعقوب لاہور کے باشندوں کی مذمت میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ اور سرفراز کے ساتھ اُس کی اکثر پُرلطف نوک جھونک ہوتی رہتی ہے۔

یعقوب بالعموم یہ کہنے کا عادی تھا کہ اگر باہر کے لوگ لاہور میں آ کر آباد نہ ہوتے تو یہ شہر علم و ادب کا مرکز بننے کی بجائے جہالت نگر ہوتا"

سرفراز نے گرم گرم چائے کی پیالی ہاتھ میں اُٹھائی اور یعقوب کے سر پر لا کر کہا "اگر تم نے زبان بند نہ کی تو یاد رکھو یہ آگ تمہارے اوپر گرا دوں گا"

ناصر کہنے لگا "سرفراز بھائی اس طرح کام نہیں چلے گا۔ دلیل سے بات ہونی چاہیئے۔ یعقوب جو کچھ کہہ رہا ہے مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ لاہور کو لاہور واقعی ہم

لوگوں نے بنایا ہے۔ لاہور سے مراد وہ لاہور نہیں جو آج سرگنگا رام روڈ کے اندر آباد ہے بلکہ وہ شہر جو میونسپل کمیٹی کے باغات سے باہر کھڑا ہے لاہور ہے اور اس لاہور کو بنانے سجانے اور سنوارنے والے ہم ہیں۔ یہاں کی علمی وادبی مجالس جنہیں دیکھ کر دلّی و لکھنؤ کی قدیم صحبتوں کی یاد تازہ ہوتی ہے ہمارے دماغ کی کاوشوں کی شرمندہ ہیں۔ یہاں کی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی درسگاہیں جن کے طفیل لاہور خطّۂ یونان بن رہا ہے۔ ہمارے خون سے سینچی گئی ہیں۔ یہاں کی ہنگامہ خیز صحافت جس کی دھاک ہندوستان کے طول و عرض میں بیٹھ چکی ہے ہمارے قلم کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں کی صنعت و حرفت اور یہاں کے سیاسی و معاشرتی اداروں کی رونق ہمارے دم قدم سے زندہ ہے۔ اگر ان تمام عناصر کو جنہوں نے لاہور کے تنِ مُردہ میں زندگی کی حرارت پیدا کر رکھی ہے خارج کر دیا جائے تو بتاؤ لاہور ایک لنگڑے، لُنجے، اندھے اپاہج سے زیادہ کیا رہ جاتا ہے؟"

یعقوب چلّا اٹھا "نامر زندہ باد۔ اور اب میرے بھائی ذرا اُس لاہور کا بھی ذکر کر دو جس پر ہمارے دوست سرفراز کو ناز ہے۔ بات یہ ہے کہ لاہور اور لاہوریت دو مختلف المعانی الفاظ ہیں۔ لاہوریت ایک استعارہ ہے جس سے مراد ایک خاص قسم کی معاشرت، خاص قسم کی زبان، خاص قسم کے رسم و رواج اور خاص قسم کا ماحول ہے جسے اُس لاہور سے کوئی تعلق نہیں جس کے ہم باشندے ہیں۔ دہلی دروازے کے اندر داخل ہو کر ٹکسالی دروازے تک چلے جاؤ۔ تمہیں جگہ جگہ لاہوریت کے لاجواب نمونے نظر آئیں گے۔ چڑیا کو چِڑی، سرفراز کو سَرفَڑاز اور سڑک کو سرک کہنا یہاں کے نصحائ

کی زبان ہے اور اس میں جاہل اور تعلیم یافتہ، مہذب اور غیر مہذب کی کوئی تمیز نہیں بات بات پر ہنسی ہنسی میں دو دو من کی گالی استعمال کرنا یا گفتگو کے دوران میں زیبِ داستان کے طور پر مقفّٰی و مسجّع مغلّظات کی بارش کر دینا یہاں کی معاشرت کا ایک عام محبوب و مرغوب پہلو ہے۔ بلدیہ کے باغات میں صبح سے شام تک لٹھ گھما گھما کر ہاؤ ہُو برپا کرنا یا کباب فروش اور فالودہ بیچنے والے کی دُکان پر دلجمعی سے بیٹھ کر نہایت کرخت آواز میں ناٹک کے گیت الاپتے رہنا۔ یہاں کے دلچسپ مشاغلِ حیات ہیں۔ اگر لاہوریّت کا حقیقی رنگ و روغن دیکھنا ہو تو اُس کی دو جگہیں ہیں۔ پہلوانوں کا دنگل یا حمام سردیوں کے موسم میں صبح کے وقت کسی حمام میں جا نکلو تو لاہور اپنے اصلی خدوخال میں نظر آجائے گا میں تفصیل اس لئے بیان نہیں کرتا کہ مبادا ہمارے دوست حضرتِ سرفراز کی طبعِ نازک پر گراں گزرے۔ یہی حال دنگل کا ہے جہاں ہر شخص اپنے لباس، اپنے اندازِ نشست و برخاست اور اپنی چال ڈھال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ تہذیب و متانت کے مروّجہ و مسلّمہ اصولوں کی پابندی کو اپنی شانِ قیادت کے منافی سمجھتا ہے۔ یہاں ہر شخص جو لباس میں زیادہ آشفتہ حال و پریشاں، زبان میں زیادہ بے احتیاط و گریزاں اور گردار میں زیادہ فحش و عریاں ہو خلیفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے اس محفل میں ہر شخص بے تاب نظر آتا ہے کہ اپنا ڈیل ڈول دکھانے کے لئے دوسرے کی پگڑی اُچھالے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے بات بات پر آستینیں چڑھائی جاتی ہیں اور سبُّ شتم کی روانی میں زبان قینچی کی طرح استعمال کی جاتی ہے۔ جو شخص ثقاہت و متانت کا جامہ

زیادہ تُندی سے تارتار کرتا ہے وہی محفل کی سرداری کا زیادہ اہل تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں پندرہ سال سے اوپر عمر کا ہر لڑکا اپنے اچھے بھلے صافے کو کانوں پر گرا کر اور تہمد کے پلّو کو دائیں ہاتھ سے اُٹھا کر اپنی چال ڈھال اور وضع قطع میں عمداً ایسا رنگ پیدا کرتا ہے جو اُسے معقول اور سنجیدہ انسانوں کی صف سے خارج کر دے کیونکہ جب تک لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار کے انداز میں سنجیدگی و معقولیت کا ذرا شائبہ بھی ہے اُسے "خلفاء" کے حلقے میں شریک ہونے کی توقع نہیں ہو سکتی اور آپ جانتے ہیں کہ لاہور میں ہر نوخیز و نوعمر نوجوان کا منتہائے نظر یہ ہے کہ وہ جلد از جلد خلیفہ بن جائے۔ باقی رہا وہ لاہور جس میں یونیورسٹی ہے، کالج ہیں، اخبارات و رسائل ہیں، تمدنی و سیاسی ادارے ہیں، علم و ادب کے چرچے ہیں، صنعت و حرفت کے ہنگامے اور شستگی و رفتگی کے نمونے ہیں سو اُس کا تعلق ہم نا چیز انسانوں کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر یہاں اقامت اختیار کر لی تاکہ لاہور کی مٹی کو سونا بنایا جائے۔"

حفیظ کہنے لگا "بعض لوگ لاہور کو بڑا مردم خیز خطہ سمجھتے ہیں لیکن آپ پنجاب اور ہندوستان کے اکابر کی فہرست سامنے رکھ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ لاہور کی مردم خیزی محض ایک بے حقیقت افسانہ ہے۔ میں نے لاہور کا جو کچھ دیکھا ہے اُس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عشق و محبت کا سوز بھی موجود نہیں البتہ رندی و ہوسناکی کے مناظر عام ہیں۔"

سرفراز خاموش بیٹھا سب کچھ سُن رہا تھا اور کبھی کبھی مسکرا دیتا تھا۔ جب حفیظ نے بات ختم کی تو اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ کہنے لگا "بھائیو، جو کچھ آپ نے

کہا ہے وہ غلط ہے یا صحیح اس پر پھر کبھی بحث کریں گے۔ لیکن سرِ دست میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حفیظ کے اس فقرے نے کہ لاہور میں عشق و محبّت کا سوز موجود نہیں۔ البتہ رندی و ہوسناکی کے مناظر عام ہیں، مجھے ایک ایسا واقعہ یاد دلا دیا ہے جو عشق کے سوز اور محبت کی بے کسی کی ایک اندوہناک مثال ہے۔ یہ ایک دردناک داستان ہے جس میں محبت کے عجز و درماندگی کے علاوہ عشق کی بے پناہ ہلاکت آفرینی کی ایک دنیا آباد ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ واقعہ گوش گزار کروں"۔

لکایک سب دوستوں کے ہنستے ہوئے چہروں کا رنگ اُڑ گیا اور اُنہوں نے یک زبان ہو کر کہا "ضرور"۔

سرفراز اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور پندرہ بیس منٹ کے بعد وہاں سے نکلا تو اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا اور چہرے پر حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر اُس نے کہا "اِس کوٹھی میں آنے سے پہلے ہم دہلی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ میں کالج میں پڑھتا تھا اور فرصت کا وقت عموماً گھر پر ہی گذرتا تھا۔ میرا کمرہ مکان کے نیچے کی منزل میں تھا جہاں دوست احباب بے تکلفی سے آنے اور اُٹھنے بیٹھنے کے عادی تھے۔ میرا ایک دوست فیاض جو دسویں جماعت تک میرا ہم مکتب و ہم سبق رہ چکا تھا ہمارے پڑوس میں رہتا تھا۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد فیاض چھ مہینے کے قریب بے کار رہا اور پھر اُسے ریل کے دفتر میں چالیس روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ یہ ایک خوش باش بے فکر کھلنڈرا لڑکا تھا۔ چار بجے

دفتر سے آکر سیدھا منٹو پارک چلا جاتا تھا جہاں کھیل کود میں سرگرمی سے حصہ لینا اُس کا روز مرہ کا معمول تھا۔ ہفتے میں دو تین بار شام کو میرے پاس آکر ضرور بیٹھتا تھا اور محلّے میں کسی شادی غمی کی تقریب پر، ریل کے دفتر کے کسی واقعہ یا اسکول کے زمانے کی کسی بات پر ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹہ گفتگو ہوا کرتی تھی۔ فیاض کے والد چمڑے کی دُکان کرتے تھے اور اچھے مرنجاں مرنج خوش حال بزرگ تھے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے فیاض نہائت دلکش انسان تھا لیکن اُسے عام نوجوانوں کی طرح بن ٹھن کر رہنے کا قطعاً شوق نہ تھا میں کبھی کبھی مذاق کے طور پر اُس سے کہتا تھا کہ "دنیا میں اچھی شکل لے کر پیدا ہونا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ اکثر لوگ ہیں کہ اگر اُن کی دنیاوی ترقی کے وسائل پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ اُن کی کامیابی کا راز اُن کی خوش جمالی میں مضمر ہے۔ تم یقیناً خوش قسمت ہو کہ قدرت نے تمہیں اِس نعمت سے نوازنے میں بخل نہیں کیا اور تم چاہو تو اس خصوصیّت سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہمعصروں میں سربلندی و امتیاز حاصل کر سکتے ہو اور اگر تمہیں اسی حالت میں رہنا پسند ہے کہ گریبان چاک ہو، بال پریشان ہوں اور چہرہ دو دو روز تک پانی کے چھینٹے سے محروم رہے تو بہتر ہے کہ اپنی شکل کسی اور کو دے دو۔"

وہ ہنس کر جواب دیتا "میں تو اب تک یہی سنتا آ رہا ہوں کہ جو انسان زیادہ جفاکش، زیادہ محنتی اور زیادہ مستعد ہے وہی اس کارگاہِ عمل میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ تم پہلے شخص ہو جس نے یہ نکتہ بتایا ہے کہ دنیا میں عروج حاصل کرنے کے لئے خوب روئی و خوش جمالی کی ضرورت ہے۔ میں تو جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ یہ ہر وقت بن سنور کر

رہنا اور صبح و شام ناز نخرے کی فکر میں لگے رہنا، مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

عادات و اطوار کے لحاظ سے فیاض بالکل سیدھی سادی طبیعت کا لڑکا تھا اُس کے مزاج کی سادگی اور بے پروائی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ہر مہینے تنخواہ لاکر اپنی والدہ کے حوالے کر دیتا اور کہتا کہ "مجھے تو صرف کھانے کے لئے دو وقت روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا درکار ہے اور یہ چیزیں مجھے اماں مہیا کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ روپے میرے کسی کام کے نہیں۔"

ایک مرتبہ اُس کی والدہ نے اُس کی شادی کا ارادہ کیا تو اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "گھر کے کام دھندوں اور بیوی بچوں کی اُلجھنوں میں بسر کرنے کے لئے ابھی عمر پڑی ہے۔ یہ دو چار سال تو مجھے اور آزادی کی ہوا کھا لینے دیجئے۔"

سیاست یا ادب سے فیاض کو چنداں دلچسپی نہ تھی۔ میرے پاس آکر بیٹھتا تو اخبار رسالے پڑھ لیا کرتا تھا یا پھر میں خود ہی کبھی کبھی اُسے کوئی دلچسپ مضمون یا اچھی سی نظم سنا دیا کرتا تھا۔

دفعتہً فیاض کی طبیعت میں انقلاب آگیا۔ وہ چُپ چاپ اور اُداس رہنے لگا۔ شام کا کھیل تقریباً ترک ہو گیا۔ چار بجے دفتر سے آکر وہ اب بھی گھر میں زیادہ نہ ٹھہرتا تھا۔ لیکن اِتنا اُس کے دوستوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ حسبِ معمول منٹو پارک نہیں جاتا۔ غروبِ آفتاب کے بعد اب وہ باقاعدگی سے ہر روز میرے ہاں آنے لگا تھا لیکن میرے مطالعہ میں حارج ہونے کی اُس نے کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اس کی عادت تھی

کہ خاموشی سے آکر، مزاج پرسی کے چند کلمات کہہ کر، میز کے قریب آرام کرسی پر دراز ہو جاتا۔ بلدرم کی خیالستان یا حسرت موہانی کا دیوان اُس کی محبوب کتابیں بن گئی تھیں۔ گھنٹہ پون گھنٹہ کرسی پر لیٹے لیٹے انہی کتابوں کے ورق اُلٹتا رہتا اور پھر چُپ چاپ اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔ میں نے دو، ایک مرتبہ اُس سے اس تکدر و اضمحلال کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اُس نے ہاں نہ میں ٹال دیا۔ اُس کے والد خود متفکر تھے کہ فیاض کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک روز وہ میرے پاس بیٹھا خالی نظروں سے ہوا میں دیکھ رہا تھا تو میں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہا تمہیں آج صاف صاف بتانا ہو گا کہ تمہاری حالت روز بروز کیوں خراب ہو رہی ہے یہ ہر وقت تم کس فکر میں غرق رہتے ہو۔ وہ تمہارا ہنسنا کھیلنا اور خوش رہنا کیا ہوا؟ تمہاری اس کیفیت سے تمہارے گھر کے لوگ اور تمہارے دوست سخت پریشان ہیں۔"

فیاض نے سر اُٹھا کر نہایت عاجزی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں حیران ہو گیا۔ میں نے بہت نرمی سے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ دوست ہوں۔ مجھ سے بلا تامل اپنی تکلیف بیان کرو اور میں دل و جان سے تمہاری مدد کروں گا۔"

فیاض نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آئے گا بلکہ اُلٹا تم میری حماقت پر ہنسو گے۔ لیکن یہ خدا جانتا ہے کہ میں آج کل کس جاں لیوا اذیت میں مبتلا ہوں۔"

میں نے اُسے پھر تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر کامل اعتماد کرو۔ تمہاری بہتری کے لئے جو کچھ بن پڑے گا میں دریغ نہیں کروں گا۔ لیکن مجھ سے اپنا راز مت چھپاؤ"

فیاض نے کہا "میں خود نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میری زندگی کا یہ انوکھا واقعہ ہے اور میں اس قدر گھبرا گیا ہوں کہ مجھے راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر میں تم سے سچ سچ کہہ دوں تو کیا تم مجھ سے نفرت تو نہ کرنے لگو گے"؟

میں نے جواب دیا "تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ میرے بھائی اگر تم دنیا کا سب سے بڑا گناہ کر کے آؤ تو بھی میں تمہاری امداد سے گریز نہ کروں گا"۔

فیاض کہنے لگا "میرے ایک بہت دُور کے قرابت دار ہیں جن کا نام میں اس وقت بتانا نہیں چاہتا۔ دو سال ہوئے اُن کی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر کہیں باہر چلے گئے تھے۔ اب تین مہینے ہوئے وہ واپس لاہور آئے ہیں میں اُن سے ملنے گیا تھا۔ اُن کی بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ اس قدر حسین اور نازک اندام لڑکی ہے کہ اُس کی مثال آج تک نظر سے نہ گزری تھی۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب اور موتیا کے پھولوں سے بنی ہوئی ایک آسمانی حُور ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی شگفتگی کا یہ عالم ہے کہ اُسے ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ فضا میں نور و سرور کی بارش شروع ہو گئی ہے۔ وہ چلتی ہے تو خدا کی قسم کوہستان کی پری معلوم ہوتی ہے جو ہوا میں اٹھکیلیاں کرتی جا رہی ہو اور وہ ہر وقت اس قدر شاداں و فرحاں رہتی ہے کہ اُس کے سامنے رنج و غم کا ذکر

کرنا گویا قدرت کی نعمتوں کی توہین کرنا ہے۔ میں نے جب سے اُسے دیکھا ہے میرا دِل میرے اختیار میں نہیں رہا۔ ایک ناقابلِ بیان خلش ہر وقت دل و دماغ کو بے قرار رکھتی ہے۔ رات کو آرام اور دن کو کام کے اوقات کا کوئی لمحہ اُس کے تصوّر سے خالی نہیں رہتا۔ میں نے اُسے بھول جانے کی بے حد کوشش کی ہے لیکن جادو کی طرح جو انسانی تصرّف و اختیار سے باہر ہو اُس کا خیال میری روح پر حاوی ہو چکا ہے میں نے اُس کے ہاں جانا ترک کر دیا ہے لیکن جوں جوں اُس سے غافل رہنے کی کوشش کرتا ہوں وہ ناقابلِ فہم طریق سے میری زندگی پر چھائی چلی جاتی ہے"۔

میں نے پوچھا۔ "کیا اُسے تمہاری اِس کیفیت کا علم ہے؟"

"بالکل نہیں۔ یہ ہو کیونکر سکتا ہے۔ میں اگر اشارۃً و کنایۃً بھی اِس کا اظہار کر دوں تو تم جانتے ہو نتیجہ کیا ہوگا۔ دو خاندان تباہ ہو جائیں گے۔ وہ ایک محبت کرنے والے شفیق و مہربان خاوند کی بیوی ہے۔ اُس کے فرائض نہایت اہم اور اُس کی ذمہ داریاں بے حد نازک ہیں اور وہ خود اپنے گھر میں اِس قدر خوش و خورم اور مسرور و مطمئن ہے کہ میں اِس مہلک راز کے اظہار کی کبھی جرأت نہ کروں گا۔ ایسا کرنا قتلِ عمد سے زیادہ خوفناک جرم ہے۔ میں اُس کے ہاں اکثر جاتا تھا۔ لیکن اب کئی ہفتے ہوئے ہیں میں وہاں نہیں گیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو گئی جس سے ذرا سا شک و شبہ بھی پیدا ہو تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے"۔

میں نے کہا۔ "اُس کو بھول جانے کی کوشش کرو۔ ایسے واقعات گاہے

گلے ہے انسان کی زندگی میں رونما ہوا ہی کرتے ہیں لیکن اُن سے اِس طرح متأثر ہونا ٹھیک نہیں۔ دفتر کا کام زیادہ محنت سے کرو اور سہ پہر کو منٹو پارک کے کھیل میں بلاناغہ شریک ہوا کرو۔ فرصت کا وقت میرے پاس گزارنے میں اگر تمہیں اعتراض نہ نہ ہو تو بلا تکلف آجایا کرو۔ مجھے مذہب سے زیادہ شغف نہیں لیکن ایسے مصائب میں دعا سے استمداد کرنا ضرور انسان کی روحانی تشفی کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے ابتلا سے نجات پانے کے لئے مذہب سے مدد طلب کرو"

فیاض کے بے تحاشا آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے بمشکل آنکھوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے کہا "میں سب کچھ کر چکا ہوں۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کس طرح راتیں جاگ کر آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ میں نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہیں کہ خدایا مجھے اِس آزمائش سے بچالے۔ میں نے محض اُسے بھول جانے کے لئے روزانہ بارہ بارہ گھنٹے دفتر کا کام کیا ہے لیکن اُس کا خیال بدستور دماغ کے گوشے گوشے میں موجود ہے۔ کام سے ذرا سر اُٹھاتا ہوں تو اُس کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ بتاؤ ایسی حالت میں میں کیا کروں۔ میں کام اور آرام دونوں سے محروم ہوں۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ دن بھر کرب و اضطراب میں بسر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر میں اس راز کو کھول دوں، اگر اُس کے سامنے جا کر اپنا سینہ چاک کر دوں۔ اگر اُس سے کہہ دوں کہ خدارا محبت کی ایک نگاہ مجھ ناچیز پر ڈال دے تو کیا ہو۔ اس خیال کی دہشت سے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اُس کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آجاتا ہے۔

اور میں اِس بات کے تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتا ہوں کہ میرے اِس فعل سے اُس کی زندگی بھر کی مسرت و راحت تباہ ہو جائے گی۔"

فیاض نے میز پر سر رکھ دیا اور اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو ٹپکنا شروع ہو گئے۔

میں نے پوچھا "اُس کا نام کیا ہے؟"

"کس کا نام"؟

"تمہاری محبوبہ کا"

"میں اُس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ میں نے آج تک اس واقعے کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر یہ بات نکل گئی تو وہ مفت میں بدنام ہو جائے گی۔ لیکن تم سے چونکہ پردہ نہیں اِس لئے میں صرف اتنا بتانے کو تیار ہوں کہ اُس کا نام ز سے شروع ہوتا ہے۔"

اس گفتگو کے ایک مہینہ بعد فیاض نے خودکشی کر لی۔ اپنے مکان کے ایک کمرے کو اندر سے مقفل کر کے اُس نے اپنے بائیں بازو کی شریان چاقو سے کاٹ ڈالی اور اُس کے جسم کا سارا خون بہہ گیا۔ میں نے جا کر اُس کی لاش دیکھی تو ایک عجیب چیز نظر آئی۔ فرش پر جگہ جگہ خون سے ز لکھا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خون بہ رہا تھا اور وہ انگلی کو خون میں ڈبو کر فرش پر ز۔ ز لکھ رہا تھا"

سرفراز نے یہ قصہ ختم کیا تو سننے والوں کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ ناصر نے پوچھا

"آخر ز کا راز بھی معلوم ہوا یا نہیں؟"

سرفراز نے جواب دیا "کچھ پتہ نہیں چلا ز سے مراد یہی زہرہ، زلیخا، زینب یا زینت ہی ہو سکتا ہے لیکن وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس راز کو محفوظ رکھنے کی خاطر تو فیاض نے اپنی جان دے دی تھی"

سرفراز نے لفافے سے ایک تصویر نکالی اور کہا "یہ فیاض کا فوٹو ہے"

مسکراتا ہوا خوبصورت سا گول چہرہ۔ پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے بال۔ لمبی لمبی آنکھیں جنہیں گھنی پلکوں کے سائے نے زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔

حفیظ نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "اللہ اللہ، ایسے ایسے انسان بھی دنیا میں موجود ہیں"

نئی زندگی کی تلاش

نئی زندگی کی تلاش

ظفر نے لوہاری دروازے کے چوک میں اخبار کا تازہ پرچہ خریدا اور وہیں کھڑے کھڑے بازار کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ شام کا وقت تھا اور انار کلی میں ہجوم کا یہ عالم تھا گویا متحرک انسانوں کا ایک سمندر بہہ رہا ہے۔ ظفر بھی آہستہ آہستہ اس ہجوم میں داخل ہوگیا

تانگوں، موٹروں، بائیسکلوں کی کثرت، پیدل چلنے والوں کے ازدحام اور گداگروں کی افراط نے فضا میں ایک عجیب قسم کا شور برپا کر رکھا تھا۔ بھیڑ کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار ہوگیا تھا۔ ظفر سوچ رہا تھا کہ اس ہجوم میں بیسیوں انسان ہوں گے جو زندگی کے حوادث کا مقابلہ کرکے تھک چکے ہیں، بیسیوں ہوں گے جو زندگی کی نعمتوں سے پوری طرح لذت اندوز ہو رہے ہیں اور بیسیوں ایسے بھی ہوں گے جو ہر لحظہ نئی دنیا کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں

خود اُسے لاہور میں آئے چار سال گزر چکے تھے۔ اُس نے شروع شروع میں سُنا تھا کہ لاہور کی معاشرت بڑے دلچسپ ہنگاموں اور عجیب و غریب داستانوں سے لبریز ہے۔ یہ بھی سُن رکھا تھا کہ اس شہر کی روزمرّہ زندگی میں انسان کو ایسے ایسے رومان انگیز واقعات پیش آتے ہیں کہ اُن کا وجود صرف ناولوں اور افسانوں کی دنیا

میں ہوتا ہے۔ظفر نے اپنی چار سال کی مسلسل، خاموش اور بے کیف زندگی میں ایک بھی رومان نہ دیکھا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اس ارادے کے ساتھ گھر سے نکلا کہ آج میں بھی کسی افسانے کے ہیرو کی طرح نیکی بدی کی متضاد طاقتوں کا شکار ہو کر اپنی ذہانت سے راہِ نجات دریافت کروں گا یا الف لیلہ کے کردار کی طرح اتفاقیہ کسی ماہ جبیں سے دوچار ہو کر اپنی بے نور زندگی کو اُس کے جلووں سے روشن کروں گا۔لیکن ہر بار یہی ہوا کہ تمام دن سڑکوں اور کوچوں کی خاک چھاننے کے بعد وہ اس حالت میں گھر لوٹا کہ اُس کے چہرے پر گرد، جسم میں کوفت اور آنکھوں میں اُداسی تھی۔

وہ حیران تھا کہ لوگ سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کہاں سے لے آتے ہیں۔کیا یہ سب کچھ جھوٹ ہوتا ہے۔کیا ہر شخص اُس کی طرح ٹھہرے ہوئے پانی کی سی زندگی بسر کر رہا ہے؛ صبح کھانا کھایا اور دس بجتے بجتے دفتر پہنچ گئے۔ وہاں چھ سات گھنٹے قلم گھسلاتے اور افسر کی گھُرکیاں سہتے رہے، شام کو تھکے ماندے گھر واپس آئے اور چارپائی پر لیٹ گئے۔وقت کا یہ اُکتا دینے والا تسلسل اُس کی زندگی کی بنیادوں کو دیمک کی طرح آہستہ آہستہ چاٹ رہا تھا۔اُس کی خواہش تھی کہ مسرت کے چھپے ہوئے خزانے کہیں سے ڈھونڈ نکالے تاکہ اُس کے دل و دماغ کی دنیا نئے نئے احساسات سے آباد ہو جائے

ظفر انہی خیالات میں محو انارکلی میں سے گزر رہا تھا کہ یکایک اُس کی ٹکر ایک مزدور سے ہو گئی جو سر پر شیشے کے برتنوں کا ٹوکرا اٹھائے مقابل کی سمت سے

آرہا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ سامنے ایک موٹر آرہی تھی۔ ظفر بچنے کے لئے بائیں ہاتھ کو مڑا لیکن اُس طرف ایک سائیکل گزر رہی تھی۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور اِس بدحواسی کے عالم میں مزدور سے ٹکرا گیا۔ اس غریب کا ٹوکرا زمین پر گر گیا اور تمام برتن ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اب ظفر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ گھبراہٹ اور ندامت سے اُس کو پسینہ آرہا تھا۔ لوگ جمع ہو گئے اور مزدور نے واویلا شروع کر دیا۔ ظفر مجرم بن کر نگاہیں نیچی کئے کھڑا تھا۔ مزدور چلا رہا تھا کہ "میرا بیس روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔ میں یہ رقم لئے بغیر یہاں سے ہلوں گا نہیں"

چند بھلے آدمیوں نے درمیان میں آکر ظفر سے کہا کہ "غلطی آپ کی تھی، بہتر ہے کہ اس غریب کو برتنوں کی قیمت ادا کر دیجئے"

اب ظفر کی کیفیت یہ تھی کہ کاٹو تو نہیں لہو بدن میں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بمشکل ڈیڑھ روپے کی ریزگاری نکلی۔ وہ حیران و پریشان دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ شاید کسی دوست آشنا کی صورت نظر آئے تو اس مصیبت سے نجات ملے اتنے میں ایک موٹر رُکی اور اُس میں سے ایک عورت نکل کر مجمع کے قریب آکھڑی ہوئی۔ اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ ہو گی۔ ناک نقشہ دلفریب اور لباس قیمتی تھا۔ وہ عورت پانچ ایک منٹ کھڑی لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ پھر دفعتہً آگے بڑھی اور مزدور سے کہنے لگی "تمہارا کتنا نقصان ہوا ہے"؟

وہ بولا "بیس روپے کا"

پھر اُس نے ظفر سے مخاطب ہو کر کہا" اگر میں یہ رقم ادا کر دوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

ظفر نے حیرت زدہ ہو کر اُس عورت کو سر سے پاؤں تک دیکھا وہ اس فرشتۂ رحمت کے نزول کی وجہ پر غور کر ہی رہا تھا کہ اُس عورت نے بٹوا کھولا اور دس دس روپے کے دو نوٹ مزدور کے ہاتھ میں دے دیئے اور خود جا کر موٹر میں سوار ہو گئی۔ یہ سب کچھ اس قلیل مدت میں ہوا کہ ظفر کو سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ مجمع منتشر ہو گیا اور مزدور مطمئن ہو کر ٹوٹے ہوئے برتنوں کو ٹوکرے میں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ ظفر لپک کر اُس موٹر کے پیچھے ہوا جس میں وہ عورت سوار تھی۔ عورت نے موٹر روک لی۔ ظفر نے قریب آکر نہایت خلوص اور لجاجت کے ساتھ اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہا" کم از کم مجھے اتنا تو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ رہتی کہاں ہیں تاکہ میں یہ رقم آپ کو واپس کر سکوں"

اُس عورت نے جواب دیا" اس بات کا تصور بھی نہ کیجئے کہ میں یہ چند روپے آپ سے واپس لوں گی۔ ہاں آپ موٹر میں بیٹھئے اور غریب خانے پر تشریف لے چلئے۔ میں اس عزت افزائی کے لئے ممنون ہوں گی"

ظفر جو پہلے ہی سے حواس باختہ ہو رہا تھا۔ یہ سن کر اور دم بخود ہو گیا اور اُس انسان کی طرح جس پر مسمریزم کا عمل کیا جا رہا ہو بغیر کسی حیل حجت کے چپکے سے موٹر میں بیٹھ گیا۔ وہ اس تمام کارروائی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ایک سراسر اجنبی اور

ناواقف خاتون اُس پر اتنا بڑا احسان کر رہی ہے اور کسی معاوضے کی خواہاں بھی نہیں۔ مختلف قسم کے خیالات اُس کے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ وہ ایک متمول، مہذب اور حسین عورت کے پہلو میں بیٹھا ایک نامعلوم مقام کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں اُس عورت نے متعدد سوالات کئے

"آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"کیا کرتے ہیں؟"

"لاہور میں کب سے قیام ہے؟"

"تنہا ہیں یا شادی ہو چکی ہے؟"

آخری سوال کے جواب میں جب ظفر نے بتایا کہ ابھی وہ تجرد کی زندگی بسر کر رہا ہے تو اُس کے دل میں یونہی کچھ اضطراب سا پیدا ہو گیا۔ ہر نوجوان کی طرح اُسے بھی کبھی کبھی اپنے متعلق خوبصورت ہونے کا وہم ہوا کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے یہ خیال اُس کے دل میں گزرا کہ شاید اُس عورت کو اُس سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ پھر فوراً ہی نادم ہو کر اُس نے گردن جھکالی

موٹر ملتان روڈ کا بارونق حصہ طے کر کے آگے نکل گئی اور ایک کوٹھی کے سامنے جس کے گرد و پیش بہت کم آبادی تھی۔ جا ٹھہری۔ ظفر کوٹھی میں داخل ہوا تو اُسے امارت کے نشانات نظر آئے۔ کمرے اعلیٰ قالینوں، خوبصورت تصویروں اور بیش قیمت فرنیچر سے سجے ہوئے تھے۔ بہت سے نوکر ادھر اُدھر کام میں مصروف

تھے۔ گول کمرے میں ادھیڑ عمر کے ایک معزز شخص ملے تو اُس خاتون نے انہیں اپنا والد کہہ کر ظفر سے تعارف کرایا۔ مختلف قسم کی باتیں ہونے لگیں۔ ظفر کو معلوم ہوا کہ وہ عورت ایک بہت بڑے رئیس کی بیوہ اور وسیع جائداد کی مالک ہے

اُس عورت نے ظفر سے کہا کہ "اس بیوگی کی حالت میں میری زندگی سخت شش و پنج میں گزر رہی ہے۔ میری عمر بھی ایسی نہیں کہ میں بقیہ زندگی اسی عالم میں بسر کر دوں۔ بہت سے پیغامات میرے پاس آرہے ہیں لیکن میں دیکھتی ہوں کہ ہر شخص میری جائداد کی وجہ سے میرا خواہاں ہے۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں اپنے آپ کو صرف اس شخص کے حوالے کروں گی جو محض میری وجہ سے میرے ساتھ نکاح کرنے پر رضامند ہو"

ظفر نے دل مضبوط کر کے کہا "میں حیران ہوں کہ کون ایسا شخص ہے جس کے حصے میں آپ جیسی حسین وجمیل اور نیک دل خاتون آئے اور وہ اُسے قبول کر لینے میں تامل کرے۔ جائداد سے قطع نظر آپ بجائے خود اتنی بڑی دولت ہیں کہ محض آپ کو حاصل کر لینا ہی دنیا جہان کی نعمتوں کو پا لینے کے برابر ہے"

ظفر کہنے کو یہ کہہ گیا لیکن اُس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا وہ آنکھیں اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا کہ ان الفاظ نے اُس عورت پر کیا اثر کیا ہے۔ یکایک وہ عورت اُس کے قریب آگئی اور ظفر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی "میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ میں نے گزشتہ چند گھنٹوں میں جو آپ کے ساتھ بسر ہوئے ہیں ہر

لمحہ محسوس کیا ہے کہ قدرت نے ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے وضع کیا ہے میری یہ ساری دولت اور جائداد آپ کے قدموں پر نثار ہے۔ مجھے آپ میں وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو ایک مکمل انسان میں ہونی چاہئیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس درخواست کو رد نہیں کریں گے"۔

ظفر کے دماغ پر یک لخت حیرت اور مسرّت کے ملے جلے جذبات کا اس شدّت سے اثر ہوا کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور کامل پانچ منٹ تک خاموش رہا۔ اُس عورت نے پھر کہا۔"بتائیے"!

ظفر نے جرأت کر کے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دئیے اور ایسی آواز سے جس میں گداز ہی گداز تھا کہنے لگا"۔ آپ ذرّے کو آفتاب بنا رہی ہیں۔ مجھ سا بے مایہ انسان کہاں اور آپ جیسی حورِ جنّت کہاں۔ آپ دولتِ حُسن اور دولتِ دنیا دونوں سے مالا مال ہیں اور میں ایک معمولی غریب آدمی ہوں۔ آپ جو عزت مجھے بخش رہی ہیں میں دل و جان کے ساتھ اُسے قبول کرتا ہوں"

نصف گھنٹے کے بعد کھانے کی میز بچھائی گئی اور ظفر نے اِس اعتماد کے ساتھ کہ وہ عنقریب اس گھر کا مالک بننے والا ہے خوب مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی کو بھول چکا تھا۔ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی زندگی کا نقشہ تھا جس میں محبت، مسرت، دولت اور بے فکری کا دور دورہ ہو گا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں مخمل سے ڈھکے ہوئے آرام دہ صوفوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے

مستقبل کا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ نکاح کا دن مقرر کیا جارہا تھا۔ ظفر آئندہ کے متعلق اپنے ارادے سنا رہا تھا۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ حالات کی پُراسرار روش نے اُسے کہاں سے کہاں لا بٹھایا ہے۔ باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے اور اب وہ سونے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ یک لخت کمرے کا دروازہ کھلا اور پولیس کا ایک افسر چند جوانوں سمیت اندر داخل ہوا۔ عورت گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور اُس کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ پولیس افسر نے بڑھ کر ظفر اور اُس عورت سے کہا "آپ میری حراست میں ہیں۔ میرے آدمی آپ کے بنگلے کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے مکان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ ہمیں شبہ ہے کہ آپ کے ہاں جعلی نوٹ بنائے جاتے ہیں"

اُس عورت کے مُنہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور ظفر جو واقعات کی پے در پے تبدیلیوں سے بے حد متاثر ہو رہا تھا کبھی اس عورت اور کبھی اُس پولیس افسر کا مُنہ دیکھتا تھا

مکان کے چپے چپے کی تلاشی لی گئی۔ ایک کمرے کا فرش اُکھاڑا گیا تو نیچے سے نوٹ بنانے کے تمام آلات نکلے۔ پچاس ہزار روپے کے جعلی نوٹ بھی دستیاب ہوئے۔ پولیس نے سب چیزوں پر قبضہ کر لیا اور کوٹھی میں جتنے آدمی موجود تھے تمام گرفتار کر لئے گئے

ظفر نے بہتیرا سر پٹیا کہ "میں بالکل بے گناہ ہوں۔ مجھے اس جرم سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ میں تو آج پہلی مرتبہ اس عورت کی دعوت پر یہاں آیا ہوں"

اُس نے انار کلی میں مزدور سے ٹکرا جانے والے واقعے کی تمام تفصیل

سنائی لیکن پولیس نے کسی عذر کو باور نہ کیا۔ کچھ روز بعد چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کیا گیا تو ظفر کو بصد کوشش ضمانت پہ رہائی ملی

مسلسل، بے کیف اور ٹھہرے ہوئے پانی کی سی یکساں ہموار زندگی سے اُکتا کر کسی رومان سے دوچار ہونے کا ظفر کا یہ پہلا اور آخری تجربہ تھا

کاشانۂ محبوب کو دیکھ کر

کاشانۂ محبوب کو دیکھ کر

میں کل دیر تک اُس مکان کے سامنے کھڑا رہا جہاں گزشتہ سال تمہارا قیام تھا تمہارے جانے کے بعد یہ مکان کئی مہینے خالی پڑا رہا۔ اب سنتا ہوں کہ اس میں پورب کی طرف کے کوئی صاحب آگئے ہیں۔ شاید اُن کے بچے بھی ہوں۔ میں نے تو صدر دروازے پر صرف اُن کے نام کی تختی آویزاں دیکھی ہے جب سے تم یہاں سے گئی ہو میں کبھی کبھی مجبور و بے اختیار ہو کر اس طرف آنکلتا ہوں تمہارے لئے اس مکان کی یاد ممکن ہے خوشگوار نہ ہو مگر مجھے اس عمارت سے محبت ہو گئی ہے۔ تمہیں یاد ہو گا سامنے کے رُخ ایک برآمدہ ہے۔ اس کے دروں پر اب چکیں ڈال دی گئی ہیں۔ تم نے ان دروازوں کو کھلا رکھا تھا برآمدے کے دائیں بائیں دونوں کمروں کی کھڑکیوں پر نیلگوں باریک پردے لٹک رہے ہیں تم نے بھی یہاں پردے ڈال رکھے تھے لیکن اُن کا رنگ سپید تھا۔ بیرونی روشوں پر کُٹی ہوئی سرخ بجری پڑی ہے اور احاطے میں پھولوں کے بہت سے گملے اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے رکھے ہیں۔ تمہیں پھول بہت پیارے تھے اور تم نے تھوڑی سی مدت میں جس کاوش سے رنگ رنگ کے پھول جمع کر لئے تھے۔ اُس نے برآمدے کے سامنے گھاس کے چھوٹے سے میدان کو تختۂ گلزار بنا دیا تھا۔

صبح وشام تم ان ننھے ننھے پیارے پیارے پھولوں کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آیا کرتی تھیں

مکان کی رونق ہمیشہ مکین سے ہوتی ہے۔ اب یہ چار دیواری میرے لئے صرف اُس مختصر سے عہدِ انبساط کی یادگار ہے جب قدرت اتفاق سے تمہیں چند روز کے لئے اِس جگہ لے آئی تھی۔ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور تمہیں شاید اُن جذبات کا خفیف سا علم بھی تھا جو مدت سے میرے دل میں پرورش پا رہے تھے اور جن کا تعلق تنہا تمہاری ذات سے تھا۔ چنانچہ جب مجھے تمہاری آمد کی اطلاع ملی تو میں اِس سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا ہوگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اور تم زندگی مستعار کے چند دن ایک ہی شہر میں بسر کرنے پر مجبور تھے اور میں جانتا تھا کہ قدرت اِتنی فیاض نہیں کہ ایسے موقعے بار بار میسّر آئیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ کہیں باہر چلا جاؤں۔ میرا یہاں رہنا نہ صرف میرے صبر و شکیب کی شدید آزمائش تھی بلکہ میں ڈرتا تھا کہ میری وجہ سے کہیں ایسے واقعات نہ رونما ہونے لگیں کہ تم پر حرف آنے کا احتمال ہو۔ اُدھر دل مچل مچل کر کہہ رہا تھا کہ جس جانِ آرزو کی خاطر عمرِ عزیز کو تباہ کیا ہے، جس برقِ جمال کی ایک جھلک نے متاعِ دین و دانش کو جلا کر راکھ کر ڈالا ہے اور جس نرگسِ خواب آلود کی یاد میں آنسو بہا بہا کر راتیں کاٹی ہیں وہ یہاں ہو اور آنکھیں اُس کی زیارت سے محروم رہیں۔ آہ یہ حرماں نصیبی، یہ سیاہ بختی میری برداشت سے باہر تھی

اچانک ایک روز مجھے ...... م مل گیا۔ مجھے اس شخص سے کبھی رغبت نہیں ہوئی۔ اُس کی حرکات سے آشفتگی اور اُس کی باتوں سے چھچھورپن ٹپکتا ہے۔ وہ سنجیدگی سے کسی موضوع پر گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ وہ اخلاق و عادات کی اُس پاکیزگی کا مالک ہے جو انسان کو دوسرے کی نگاہ میں محبوب بنا دیتی ہے لیکن قدرت کی بے نیازی کو کیا کہیے کہ اسی ...... م کو تمہاری خدمت میں باریابی حاصل ہے۔ میں نے بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر، سرسری طور پر اُس سے تمہارے متعلق پوچھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری گفتگو سے یہ ظاہر ہو کہ میں کس شیفتگی و دلبستگی کے ساتھ تمہاری باتوں میں دلچسپی لیتا ہوں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تم چند ضروری امور کی خاطر صرف دو، ایک ماہ یہاں ٹھہرو گی۔ میں جب واپس گھر آیا تو میرے دل و دماغ میں خطرناک کشمکش جاری تھی۔ دماغ کہتا تھا کہ اپنے کو آزمائش میں ڈالنا اور زندگی کا سکون برباد کر لینا حماقت ہے۔ دل کا مشورہ تھا کہ اگر زندگی کی ساری راحت اور عمر کا سارا آرام دے کر تیری ایک غلط انداز نظر، ایک تغافل پیشہ نگاہ میسر آ جائے تو سودا مہنگا نہیں۔

دو عالم نقد جاں بر دست دارند
بہ بازارے کہ سودائے تو باشد

میں جب پہلی مرتبہ تمہارے مکان کے دروازے پر پہنچا تو میرے دل میں رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ شاید تم آج اُس مغائرت کو دور کر دو، اُس حجاب کو اٹھا

وہ جس نے برسوں سے ہمارے درمیان ایک مصنوعی بیگانگی کی خلیج حائل کر رکھی تھی۔ تمہارے ذوقِ ادب کے طفیل میرے اکثر مضامین تمہارے مطالعہ سے گذر چکے تھے اور تم نے بارہا اپنی ملنے والیوں سے فخریہ انداز میں کہا تھا کہ "اِس تحریر کے پسِ پردہ جو کرب و اضطراب جھلک رہا ہے میں اُس کے راز سے واقف ہوں"۔ اور پھر ایک مرتبہ تم نے یہاں تک بھی تو کہہ دیا کہ "اِن مضامین کا مصنف اپنے خونچکاں دل کے جن گوشوں کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے۔ میں مدت ہوئی اُن سے آگاہ ہوں"۔

یہ باتیں مجھ تک پہنچیں تو میں ایک مجنونانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑا کہ شاید تم ازراہِ ہمدردی یا اعترافِ حقیقت کے خیال سے اُن زخموں کے لئے کوئی مرہم بھیجو جن کی ٹیسیں الفاظ کا جامہ اوڑھ کر تمہیں میرے درد والم کا احساس کرا چکی ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ تم نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے صرف اس لئے بے رُخی اختیار کی کہ تمہیں میرے رنج وغم کی پروا نہ تھی یا یہ کہ تمہیں طعنِ اغیار کا خوف دامنگیر تھا۔

میں نے تمہیں ایک ایسے جذبۂ بے پناہ کے ساتھ چاہا کہ میرے غم نصیب دل کو دنیا میں کہیں اماں نہ ملتی تھی۔ لیکن اس آگ کو جس کی ایک رمق بہ مشکل تم تک پہنچ سکی میں نے ہمیشہ اپنے سینے میں دفن کئے رکھا۔ تم ہی بتاؤ اگر میں ان شعلوں کو دبا دبا کر نہ رکھتا، اگر یہ چنگاریاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح ایک لمحہ کے لئے منظرِ عام پر آجاتیں تو میں اور تم کہاں ہوتے۔ میں نے اپنے آپ پر شدت سے جبر

کیا، میں نے ہمیشہ اپنی آرزوؤں کا سر کچلا لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ پیہم صبر و ضبط سے میرا کلیجہ چھلنی ہو کر رہ گیا۔ میرا سینہ اندر ہی اندر سلگنے والی آگ سے تنور کی طرح جل اُٹھا میں نے اپنے آپ کو ہلاکت کے منہ میں ڈالنا گوارا کیا لیکن وہ راز جس سے تمہاری حرمت و تقدیس وابستہ تھی۔ میری زبان پر نہ آسکا۔ میں برسوں اِس انتظار میں رہا کہ تم محبت کا ایک لفظ مجھ کو بھیجو، عنایت کی ایک نظر مجھ پر ڈالو۔ میری سینکڑوں راتیں اِس اُمید میں کٹ گئیں کہ شاید تمہیں رحم آئے اور میری دِلوں کی بے قراری اور راتوں کی بیداری کو چین کی نیند میسّر ہو۔ تم نے خرمن میں آگ لگا دی اور جی بھر کے تماشا دیکھا۔ تم نے طوفان کا منہ کھول دیا اور میری زندگی کی ناؤ ڈانواں ڈول ہو گئی۔ کاش تمہیں آگ بجھانے کی توفیق ملتی، کاش تم اس طوفان کو فرو کرنے کی تدبیر سے آگاہ ہوتیں، کاش تم اتنا سوچتیں کہ جس دل کو تمہاری آنکھوں کے جادو اور تمہارے تبسّم کی بجلیوں نے مجروح کیا ہے اُس پر مہرو اُلفت کا ایک پھاہا رکھنا آئینِ مروّت کے خلاف نہیں۔

میں صبر کر چکا تھا۔ ایک یاس آشنا سکون جسے فریبِ اُمید پراگندہ نہ کر سکے مجھ پر حاوی ہو چکا تھا۔ قدرت کے اِس فیصلے پر کہ میرا دل تمہاری محبت کے داغوں سے ہمیشہ لالہ زار رہے اور مجھے تمہاری بارگاہِ ناز میں کبھی شرفِ نیاز حاصل نہ ہو میں سرِ تسلیم خم کر چکا تھا کہ حالات نے یکایک کروٹ لی۔ اور زمانے کی ستم ظریفی نے ہمیں چند روز کے لئے ایک ہی فضا میں سانس لینے پر مجبور کر دیا۔

میں جب پہلے پہل تمہارے مکان میں داخل ہوا تو میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی سمجھ رہا تھا۔ مجھے تم سے کسی پذیرائی کی توقع نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ تم اُس بے اعتنائی کا اظہار کرو گی جو ابتدا سے تمہارا شیوہ رہا ہے۔ تمہاری مجبوریوں سے میں بے خبر نہ تھا لیکن غضب خدا کا ان مجبوریوں کے باوجود تمہاری دلپذیر گفتگو، تمہارا حُسنِ سلوک، تمہاری عنایات و مدارات اوروں پر ابرِ رحمت کی طرح برسنے میں دریغ نہ کرتی تھیں۔

میں نے تمہارے مکان کے برآمدے سے گذر کر جب بڑے کمرے میں قدم رکھا تو تم، شاید پاؤں کی آہٹ سن کر، اس خیال سے کہ کون آرہا ہے، منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ تمہارا آنچل جو تمہارے سر کے معطّر، لمبے لمبے، سرکش بالوں سے ہمیشہ دب جاتا ہے۔ تمہارے شانے پر لٹک رہا تھا اور تم دیوار کے ساتھ لگی ہوئی یوں چُپ چاپ کھڑی تھیں گویا مصوّر کا حسین ترین شاہکار ہو۔ مجھے دیکھ کر بھی تم نے جنبش نہ کی۔ صرف ایک خفیف، نامعلوم، ہلکا سا تبسم تمہارے چہرے پر دوڑ گیا اور تمہاری آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ گویا تم مجھ سے صاف کہہ رہی تھیں "یہاں بھی آ گئے ہو۔ یہ جراٴت؟ آخر کب تک اس طرح حیران و سرگرداں پھرتے رہو گے؟ ان باتوں سے کیا حاصل؟ اپنی زندگی کیوں خراب کر رہے ہو؟" مجھے بھول کیوں نہیں جاتے؟ تمہارے حوصلے کی تعریف کرنی چاہیئے۔ بے شک تم نے حیرت انگیز صبر و ضبط سے کام لیا ہے۔ لیکن اگر

تم اس روش پر قائم ہی رہنا چاہتے ہو۔ اگر تمہیں یہ منظور نہیں کہ ہم اس آگ سے زیادہ گرم، زہر سے زیادہ مہلک اور پہاڑ سے زیادہ بوجھل راز کو اپنے اپنے دل میں چھپا کر ہمیشہ کے لئے علٰحدہ ہو جائیں تو پھر آؤ، بیٹھو، پچھلی باتیں جانے دو، جو ہوا سو ہوا۔ مجھے اپنے دکھ درد کی کہانی خود اپنی زبان سے سناؤ۔"

تم بمشکل دو مہینے یہاں ٹھہریں۔ ہمارے درمیان بہت کم باتیں ہوئیں لیکن وہ فصاحت جو صرف آنکھوں کے حصّے میں آئی ہے۔ ہمیشہ محوِ تکلم رہی۔ تم نے سب کچھ کہہ دیا جو تمہیں کہنا تھا میں سمجھ گیا کہ گہرے پانی کی سطح ہمیشہ ساکن ہوتی ہے۔ اب تم مجھ سے سینکڑوں کوس دُور ہو اور زمانے کی رفتار کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہم شاید کبھی یک جا نہ ہو سکیں گے۔ خانۂ دل جو تمہارے ہاتھوں بن بن کر بگڑا اب صرف ان آرزوؤں سے آباد ہے جو حسرتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ کیا یہ کبھی نہ ہو گا کہ تمہارے دیارِ حُسن سے آنے والی ہوائیں تمہاری آواز کا ترنم، تمہاری باتوں کا رس، تمہاری دلبری کی ادائیں۔ تمہاری آنکھوں کی شوخیاں، تمہارے ہونٹوں کی رنگینیاں، تمہارے لباس کی خوشبوئیں۔ اور تمہارے بالوں کا عنبر اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر اس طرف لے آئیں اور یہ جان حزیں گھڑی بھر کے لئے تم سے ہم کنار ہو جائے؟

فریبِ خیال

فریبِ خیال

دعوت میں شریک ہونے والوں کی تعداد سو سے کسی صورت کم نہ تھی۔ کوٹھی کے وسیع احاطے میں نہایت قرینے سے چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ چائے کا اہتمام بڑے تکلّف سے کیا گیا تھا اور کھانے پینے کی ہر چیز سے خوش سلیقگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مہمانوں میں ہر طبقے اور ہر مذاق کے لوگ موجود تھے۔ وکلا تھے، اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر تھے۔ سرکاری حکام تھے۔ رؤسا تھے۔ چند مشہور شاعر اور مصوّر بھی تھے۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ سبزے کے فرش پر جگہ جگہ پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے اور اوپر رنگ برنگ کاغذ کے پھولوں کی بیلیں لہرا رہی تھیں۔ میزبان اور اُن کے دونوں صاحبزادے خود مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔

اِس مجمع میں ایک شخص اپنی وضع قطع کے اعتبار سے زیادہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ دوہرے بدن کا نکلتا ہوا قد۔ جسم پر سیاہ سمور کا لمبا کوٹ حالانکہ سمور پہننے کا رواج مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا، پاؤں میں چمک دار چمڑے کا پمپ اور سفید زمین پر سیاہ لکیروں والے کپڑے کی پتلون سر کے بال بہت لمبے جنہیں پشت کی طرف پھینکا ہوا تھا۔ قلمیں بڑھی ہوئیں جو رخسار کے عین وسط تک پہنچ رہی تھیں

جب چائے ختم ہو چکی تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کبھی اِس میز پر کبھی اُس میز پر جا کر لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا بعض مہمان اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں؟"

اُس نے جواب دیا "نام تو میں نہیں جانتا لیکن یہ شاید یہاں وینس تھیئٹر میں پیانو بجاتے ہیں"۔

دعوت کے اختتام پر صاحبِ خانہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور تقریب بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ اتوار کے دن صبح نو بجے میرا ملازم ایک ملاقاتی کارڈ لایا جس پر انگریزی حروف میں "ایم۔ ایچ۔ رشید ا، بی اے" مرقوم تھا۔ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہ تھا میں نے ملازم سے پوچھا "تم جانتے ہو یہ کون صاحب ہیں؟"

اُس نے جواب دیا "جناب، اس سے پہلے تو یہ کبھی نہیں آئے میں نے بھی آج ہی انہیں دیکھا ہے"۔

میں نے کہا "انہیں بڑے کمرے میں بٹھاؤ میں ابھی آتا ہوں"۔

دس منٹ کے بعد جب میں بڑے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرا ملاقاتی وہی شخص ہے جو دعوت میں سیاہ سمور کا کوٹ اور چمک دار چمڑے کا پمپ پہن کر شریک ہوا تھا۔

میں نے کہا "معاف کیجئے، اُس روز پارٹی میں آپ سے شرفِ نیاز حاصل نہ ہو سکا۔ میں مدت کے بعد لاہور آیا ہوں اس لئے نئے دوستوں سے ملاقات پیدا کرنے کے لئے بھی کچھ وقت چاہیئے۔"

اُس نے کہا "یہ صحیح ہے لیکن میری جرأت تو دیکھئے کہ آپ سے متعارف ہوئے بغیر آپ کے مکان پر آدھمکا ہوں۔"

میں نے کہا "آپ کی اس تکلیف فرمائی کا بے حد شکریہ۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ شوق سے تشریف رکھئے۔"

جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو میں نے کہا "کیا میں آپ کا پورا اسم گرامی دریافت کر سکتا ہوں؟"

اُس نے جواب دیا "میرا نام محمد ہارون شیدا ہے۔ دو سال سے لاہور میں مقیم ہوں۔ اس سے پہلے الہ آباد تھا۔ بچپن کلکتے میں بسر ہوا ہے۔ کسی ایک شہر کو وطن کہنا میرے نزدیک جائز نہیں۔ ہم لوگ دنیا کے باشندے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "میں بھی وطن پرستی کو شرکِ مکانی سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود ایک جگہ سے تعلقِ وطن قائم ہے۔"

اُس نے کہا "ہاں، میں نے آپ کی تحریروں میں دیکھا ہے کہ آپ بہت التزام سے اپنے نام کے ساتھ اپنی نسبتِ وطن ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا "اس کی وجہ وطن پرستی نہیں بلکہ محض اپنے نام کو ایک

امتیازی رنگ دیتا ہے"۔

اُس نے کہا "مسلمات عہد کی پابندی صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اپنی انفرادی شخصیت کے شعور سے محروم ہیں۔ یہ شعور بہت سے اشخاص میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے لیکن تقلید کے اس جذبے سے جو ہندوستان میں عام ہے دب کر ضائع ہو جاتا ہے۔ لکیر کا فقیر بنے رہنے سے انسان کی اجتہادی قوتیں بروئے کار نہیں آ سکتیں"۔

میں نے کہا "سچ بات یہ ہے کہ سماج کی عافیت تقلید ہی میں ہے۔ مسلمات عہد کی پابندی سے انحراف کرنا پیغمبروں کو زیبا ہے یا باغیوں کا کام ہے۔ ایک عام آدمی کے لئے یہ انحراف اس وقت تک نقصان رساں نہیں جب تک اُس کے اعمال و خیالات قانون سے متصادم یا دیگر ہم جنسوں کی آسائش میں خلل انداز نہ ہوں۔ قانون اور اخلاق نے انسان کی آزادی پر چند حدود عاید کر دی ہیں جن کے اندر رہ کر ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنے شوق کی تشفی کے لئے جو سامان چاہے پیدا کرے"۔

ہم نے فوراً محسوس کیا کہ ہماری گفتگو بہت ٹھوس ہو رہی ہے اور پھر دو آدمیوں کا پہلی ہی ملاقات میں اس قسم کی باتیں لے بیٹھنا یوں بھی کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا تھا میں نے کہا "شیدا صاحب، چھوڑیئے اس قصے کو، آپ شاعر ہیں اپنے شعر سنایئے"۔

اُس نے کہا "معاف کیجئے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں

شیدا میرا تخلص نہیں ہے۔ یہ فقط ایک خاتون کا عطیہ ہے۔ جنہیں میرا نام پسند نہیں تھا۔ انہوں نے میرے نام کے ساتھ اس لفظ کا اضافہ صرف اس لئے کر دیا کہ وہ مجھے اس نام سے بلانا چاہتی تھیں"۔

میں نے کہا "پھر تو یہ تخلص سے بھی زیادہ دلچسپ اور رومان انگیز چیز ہے۔ اپنی داستانِ معاشقہ کا کوئی باب ہی سنائیے"۔

شیدا نے قہقہہ لگا کر کہا "آپ نے یہ کیوں کر جانا کہ لفظ شیدا کا تعلق کسی داستانِ معاشقہ سے ہے"؟

میں نے کہا "میرے پاس دلیل تو کوئی نہیں۔ البتہ آپ کی باتوں سے یہ جھلک رہا ہے"۔

شیدا اور میں جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ بہت خوش مزاج اور زندہ دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا لیکن اپنی عمر کا ابتدائی حصہ اس نے اپنے چچا کے پاس کلکتے میں بسر کیا تھا۔ اسکول کی تعلیم اُس نے وہیں ختم کی تھی اور پھر وہ علی گڈھ چلا گیا تھا۔ جہاں سے اُس نے بی اے کی سند حاصل کی تھی۔ کلکتے کے قیام کے دوران میں شیدا کو موسیقی سے خاص اُنس ہو گیا تھا اُس کی وجہ کچھ تو کلکتہ کا ماحول تھا اور کچھ اُس کا اپنا فطری رجحان۔ علی گڈھ میں بھی طالب علمانہ مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اِس شوق سے غافل نہیں رہا تھا۔ تعطیلات میں وہ اکثر لکھنؤ چلا جاتا تھا۔ جہاں استادین، بندہ بن ادہ

ظہیر خاں جیسے ماہرِ فن اُستادوں سے تلمذ پیدا کر کے اُس نے کسب فیض کیا تھا۔ ساز بجانے میں بالخصوص اُسے کمال حاصل تھا۔ ستار، دلربا، وائلن، پیانو، ہارمونیم غرض کہ ہندوستانی اور ولائتی دونوں قسم کے سازوں میں اُسے خوب مہارت تھی۔

اُس کے چچا جو ابتدا سے اُس کی پرورش کر رہے تھے۔ اِس شوق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ اس خیال سے خاموش رہے کہ آج کل کے نوجوان گانے بجانے کے شوقین ہوا ہی کرتے ہیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ شوق جائز حدود کو عبور کر کے پیشہ ورانہ شغف کی صورت اختیار کر رہا ہے تو انہوں نے اُس کی مخالفت کی۔ شیدا کی خودسری نے اس مخالفت کو اور زیادہ بدمزگی کا رنگ دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں رنجش بڑھتی گئی۔ اور شیدا جب علی گڈھ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا تو کلکتے جانے کی بجائے سیدھا بمبئی چلا گیا جہاں ایک فلم کمپنی میں اُس نے ملازمت اختیار کر لی۔

بمبئی کی فضا اُس کے حسب خاطر نہ تھی، اس لئے مختصر سے قیام کے بعد وہ الہ آباد لوٹ آیا۔ یہاں گلوب تھیٹر میں آرکسٹرا کا مہتمم مقرر ہو گیا۔ اُس کی طبیعت میں آزاد روی اور جدت پسندی شروع سے تھی۔ اب کہ وہ معاش کی طرف سے ایک حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ اُس نے زندگی کی شاہراہ پر صرف اپنے ذوق اور اپنی ذہانت کو رہنما بنا لینا کافی سمجھا۔ تقلید اور پیروی سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اگر کھانے پینے اور پہننے میں انسان صرف اپنے ہی ذوق کی رعایت روا رکھے اور مروجہ رسوم

کی پروا نہ کرے تو بھی سماج کے طور طریقوں سے اس کا تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن شیدا تو اپنے مذاق کی پذیرائی کے سامنے معاشرت کی پابندیوں اور تمدن کے اصولوں کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ ایسے باغی کے لئے بھلا قدامت پسند اور روایات پرست دنیا میں کہاں گنجائش ہو سکتی ہے۔ الہ آباد میں آہستہ آہستہ وہ طعن وتشنیع کا ہدف بننا شروع ہوا۔ بعض لوگ اُس کی ہنسی اُڑاتے تھے بعض اُس سے نفرت کرتے تھے۔ اور بعض اُس کے دشمن بن گئے تھے جب اُس نے محسوس کیا کہ ہیئت اجتماعی اُس کی انفرادیت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یو پی کے باشندے سخت دقیانوسی قسم کے لوگ ہیں جو ہر جدت کو بدعت سمجھ کر روشن خیالی کے بدترین دشمن ہیں۔ پنجاب کے متعلق وہ ہمیشہ حسن ظن کا شکار رہا تھا۔ چنانچہ الہ آباد سے دل برداشتہ ہو کر وہ لاہور چلا آیا اور ونیس تھیئٹر میں پیانو بجانے پر ملازم ہو گیا۔

تھوڑے عرصے میں اُس کی انوکھی روش نے یہاں بھی اُس کو لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا دیا۔ طلبہ کے حلقے میں وہ یقیناً روز بروز مقبول ہو رہا تھا لیکن سنجیدہ اشخاص میں اُس کو چنداں وقعت حاصل نہ تھی۔ چونکہ گانے میں اس کو مہارت تھی اور علی گڑھ کا گریجوایٹ ہونے کی وجہ سے وہ گویا علمی وقار کا مالک بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اکثر تقاریب میں اُس کو شرکت کے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے تھے۔ ظاہری وضع قطع میں بھی اُس نے ایسا پہناوا اختیار کر رکھا تھا کہ بڑے بڑے

مجمع میں اُس کی جانب اُنگلیاں اٹھنا شروع ہو جاتی تھیں کبھی اچکن کے ساتھ جودھ پوری طرز کی پگڑی باندھ کر آ جاتا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ بہت بڑا کلاؤنت ہے۔ کبھی سیاہ فراک کوٹ اور سُرخ ترکی ٹوپی پہن کر خالص علی گڑھی لباس میں نمودار ہوتا تھا بعض اوقات کھلی آستینوں کا کرتہ اور تہمد اور پاؤں میں سلیپر پہن کر وہ اس طرح بے تکلفی سے آ جاتا تھا گویا یہی مہذب دنیا کا لباس ہے۔ کبھی جی چاہتا تو گاندھی ٹوپی اور کھدّر کی دھوتی پہن کر نکل آتا تھا۔ سوٹ پہننے میں تو اُسے ایسا ملکہ تھا کہ کم ہندوستانیوں کو ہو گا۔ میں نے جب اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو سمور کا بنا ہوا لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھا۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے الہ آباد اور کلکتے کی باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے وہاں کے دلچسپ حالات سنا رہا تھا اور کبھی کبھی کسی لطیفے پر ہم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ دفعتاً مجھے یہ ندامت آمیز خیال آیا کہ میں نے اُسے چائے تک کے لئے نہیں پوچھا۔ میں نے کہا "شیدا صاحب، معاف کیجیے میں نے آپ کو نہ کھانے کو پوچھا ہے نہ چائے کو۔ اگر آپ کہیں تو ملازم چائے لے آئے۔"

اُس نے فوراً جواب دیا "جی نہیں۔ کھانے سے زیادہ لذیذ اور چائے سے زیادہ مفرّح تو یہ گفتگو ہے۔ بھوک ہو تو میں کبھی عذر نہیں کرتا لیکن محض رسم کا لحاظ کر کے دوستوں کے کام و دہن کی تواضع کرنا مجھے ہرگز پسند نہیں۔ ہمارے ہاں یہ عجیب دستور ہے کہ جب کوئی شناسا یا دوست یا عزیز ملنے کے لئے مکان پر آئے تو ضرورت ہو یا نہ ہو سب

سے پہلے اُسے کچھ کھلانا پلانا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فرض فوراً سر انجام نہ دیا جائے تو ملاقاتی بھی خفا اور صاحبِ خانہ بھی ناراض۔ میرا خیال ہے۔ جب انسان ارتقائی دَور کی اوّلین منزل میں تھا تو اُسے سوائے اپنا پیٹ بھرنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ جوں جوں انسانی عقل و خرد اور تخیل و احساس کی کارفرمائی بڑھتی گئی۔ پیٹ کی ضروریات مؤخر اور قلب و دماغ کی ضروریات مقدّم حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ آج جبکہ علم و فن نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے انسانی ضروریات کا وہی مذاق اور معیار برقرار رکھنا جو زمانہ ماقبل تاریخ میں تھا غلطی ہے۔"

میں نے کہا "تو کیا آج تعلیم یافتہ انسان ہوا پھانک کر گزارہ کرتے ہیں؟ کیا اُنہیں جسم و جان کا رشتہ بحال رکھنے کے لئے روٹی کی ضرورت نہیں؟"

اُس نے ہنس کر کہا "ہوا پھانک کر تو یوں گزارہ کرتے ہیں کہ آج کل ہر دماغی کام کرنے والا شخص سوءِ ہضم کا شاکی ہے۔ پھر ایسی سوسائٹی میں جہاں سوءِ ہضم کی شکایت اس درجہ عام ہو یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ خاطر تواضع کا تنہا یہ طریقہ باقی رکھا جائے کہ موقع بے موقع معدہ و امعاء پر بوجھ لاد دیا جائے۔ انسان مراد حواسِ خمسہ سے ہے۔ ہم نے صرف حاسۂ ذائقہ کی تواضع ضروری سمجھ رکھی ہے اور باقی چاروں حواس نظر انداز کر دیئے ہیں۔ حالانکہ ایک تربیت یافتہ سماج میں

ترتیب بالکل اُس کے اُلٹ ہوتی ہے۔ جب علم و ادب کی ترقی سے سوسائٹی میں تہذیب و شائستگی پیدا ہو جائے اور فنونِ لطیفہ کے رواج سے جمالیات کا شعور فروغ حاصل کرلے تو پھر افراد کا فرض ہے کہ سامعہ، باصرہ اور شامہ نواز اشیاء سے ایک دوسرے کی خاطر مدارات کیا کریں"۔

مَیں نے کہا "بہت اچھا حضرت، اب آپ کے لئے ناچ رنگ کا انتظام کرتا ہوں"۔

چند ہفتوں میں میرے اور شیدا کے مراسم کافی ترقی کر گئے۔ ہم ایک دوسرے کے ہاں بے تکلفی سے آنے جانے لگے۔ وہ عجیب خصوصیات کا آدمی تھا۔ اپنے افعال کے لحاظ سے بالکل بے ضرر لیکن خیالات کے اعتبار سے بہت پریشان کُن اور دلچسپ۔ مذہب سے اُسے سخت عناد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "مذہب چند بے جان رسوم کا نام ہے جنہوں نے انسان کے ہوش و حواس پر اس طرح قبضہ جما رکھا ہے کہ غور و فکر کی تمام صلاحیتیں سلب ہو گئی ہیں۔ ہندوستان میں مذہب کے ہاتھوں جس جس طرح ہماری مٹی پلید ہو رہی ہے اُس کا سب سے دردناک پہلو ہماری غلامی ہے۔ غور کیجئے کہ یہاں ہم کھڑے ہیں اور سامنے آزادی کی دیوی ہے جس کے جلو میں دولت و حکومت کی تمام نعمتیں اور جاہ و حشمت کی تمام سرفرازیاں ہیں لیکن ہمارے اور اس دیوی کے درمیان مذہب ایک اژدہے کی طرح حائل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس لاش کو کب تک اپنے

کندھوں پر اُٹھائے پھریں گے“

اُس کی خواہش تھی کہ وہ روزمرہ زندگی کی فرسودہ اور پامال روش سے ہٹ کر چلے خواہ اُسے یہ امتیاز پیدا کرنے کے لئے لوگوں کے تمسخر و استہزا کا نشانہ ہی بننا پڑے۔ اس خواہش نے اُس کے ذوق و نظر میں بھی ندرت پیدا کر دی تھی۔ ایک روز میں اُس کے ہاں گیا تو وہ کہنے لگا۔ ”آئیے، آج آپ کی آنکھوں کی ضیافت کروں“

یہ کہہ کر اُس نے ایک بڑا سا البم کھولا جس میں قدیم و جدید مصوّری کے بہترین نمونے موجود تھے۔ چند حسین و جمیل عورتوں اور خوشنما قدرتی مناظر کے فوٹو تھے۔ وہ ورق اُلٹتا رہا اور ہر تصویر کی فنّی خوبیاں شرح و بسط سے بیان کرتا رہا۔

گانا تو وہ تقریباً ہر ملاقات میں سناتا تھا۔ مختلف قسم کے سازوں کی آوازیں علیحدہ علیحدہ نکال کر بتاتا اور پھر اُن میں سے بعض کو ہم آہنگ کر کے کبھی سخت کرخت اور کبھی نہایت لطیف آواز پیدا کرتا تھا۔ ایک دن وہ میرے مشامِ جاں کی مدارات کرتا رہا۔ لکھنؤ، قنوج اور جون پور کے بیش بہا عطر اس کے پاس موجود تھے۔ طرح طرح کی ولائتی اور ایرانی خوشبوئیں بھی تھیں۔ ان سب کو شیشیوں میں بند کر کے اُس نے ایک صندوقچی میں مقفل کر رکھا تھا۔ اسی طرح ایک اور دلچسپ واقعہ مجھے یاد ہے۔

جاڑوں کے دن تھے اور سردی خوب زوروں پر تھی۔ ایک روز شام کے قریب میں اُس کے مکان پر گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پکار اُٹھا ”آپ بہت اچھے وقت آئے

بس آج کی رات یہیں رہیے"۔

میں نے تعجب سے پوچھا "خیریت تو ہے"؟

کہنے لگا "بالکل خیریت ہے میں نے بمبئی سے ایک نہایت اچھی چیز منگوائی ہے جسے آپ اس موسم میں یقیناً پسند کریں گے"۔

میں نے کہا "بمبئی میں اِن دِنوں پرتگال کی بنی ہوئی شراب کثرت سے فروخت ہو رہی ہے۔ کہیں اس کی سو پچاس بوتلیں تو نہیں منگوالیں"؟

ہنس کر کہنے لگا "لاحول ولا، آپ کو بھی کیا سوجھا ہے"۔ اور دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ وہاں سے لکڑی کا ایک بکس اٹھا لایا جس میں سے ایک ریشمیں لحاف نکال کر میرے اوپر ڈال دیا۔ یہ بمبئی کی ایک مشہور ولائتی فرم کا بنا ہوا نہایت خوبصورت اور نرم و نازک لحاف تھا جس کے اندر بہت نفیس اور قیمتی پر بھرے ہوئے تھے۔ میں نے لحاف کے بیش قیمت مکلّف و مطلا کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اس لحاف کو اوڑھ کر سونا جسمانی عشرت کی معراج ہے"۔

کہنے لگا "میں نے اب تک اسے استعمال نہیں کیا۔ جی یہی چاہتا تھا کہ کبھی آپ تشریف لائے تو اس سے آپ کی تواضع کروں گا"۔

شیدا نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور نہ بظاہر اس کا ارادہ شادی کرنے کا تھا۔ شیدا کے مکان سے تھوڑی دور، اسی سڑک پر، ہومیوپیتھک کے ایک ڈاکٹر رہتے تھے۔ اُن کی بیوی شعر و سخن کی دلدادہ اور کسی قدر گانے بجانے کی

بھی شوقین تھی۔ شیدا کو اُس سے محبت ہو گئی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگا "ڈاکٹر نے اس عورت کی زندگی کو بے حد تلخ بنا رکھا ہے"۔

میں نے پوچھا "کیونکر؟"

کہنے لگا ڈاکٹر خود تو بالکل ٹھوس اور جامد طبیعت کا انسان ہے اور وہ بہت رنگین خیال، شگفتہ مزاج اور خوش طبع خاتون ہے۔ دونوں کے مذاق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ کمبخت دن رات اُسے طعنے دے دے کر جلاتا رہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے گانا بجانا رنڈیوں کا کام ہے کبھی کہتا ہے کہ شرفا کی بہو بیٹیوں کو شعر و سخن سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ مجھے اس عورت سے ہمدردی ہو گئی ہے بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ محبت ہو گئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے اپنے پاس لے آؤں"۔

میں نے چونک کر کہا "اِس سے آپ کا کیا مطلب؟ کیا ڈاکٹر اسے طلاق دے رہا ہے؟"

"طلاق ولاق میں نہیں جانتا۔ کیا آپ کسی بدمذاق آدمی کے ساتھ ایک گھنٹہ بھی بسر کرنا پسند فرماتے ہیں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ صحبتِ ناجنس کے عذاب کو تمام عمر محض اس لئے برداشت کیا جائے کہ مذہب نے اُس پر جواز کی مہر ثبت کر دی ہے؟ سماج یہ تو گوارا کرتا ہے کہ دو انسان جو فطری و معنوی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر اجنبی ہیں کہ عام حالات کے اندر شاید آپس میں گفتگو کرنا بھی پسند

نہ کریں۔ صرف اس لئے ایک دوسرے کے ساتھ شکنجے میں جکڑے رہیں کہ سوءِ اتفاق سے ایک مُلّا کی زبان سے چند کلمات نکل چکے ہیں لیکن سماج کو یہ منظور نہیں کہ دو ہم خیال، ہم ذوق اور ہم مشرب افراد اطمینان و مسرّت سے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کریں۔ نکاح آخر ہے کیا؟ جب دو دل مل جائیں تو پھر کسی بے معنی رسم کے ادا کرنے کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے؟ رسموں نے انسان کی روح کو کچل دیا ہے۔ تنہا روح کو ہی نہیں کچلا جسمانی مسرّتوں کو بھی تباہ کر دیا ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا "میں آپ کا صحیح مفہوم اخذ نہیں کر سکا۔ کیا آپ اس فعل کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے کہ ایک بیاہتا عورت اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسرے مرد کے پاس چلی جائے؟"

وہ بہت جوش سے کہنے لگا "مجھے کوئی اعتراض نہیں میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔ چند بے جان رسوم کی خاطر زندگی جیسی گراں مایہ چیز کو رائگاں کھو دینا حماقت ہے۔ انسان دنیا میں ایک ہی مرتبہ آتا ہے۔ بار بار زندگی کسے نصیب ہوتی ہے۔"

ایک روز اچانک مجھے کچہری سے ٹیلی فون آیا۔ شیدا بول رہا تھا "جلدی آو۔ خدارا جلدی پہنچو۔"

میں بھاگا بھاگا وہاں گیا تو عجب منظر دیکھا۔ شیدا کے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی

اور وہ پولیس کی حراست میں عدالت کے کمرے سے باہر کھڑا تھا معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر کی بیوی کو اغوا کر لایا ہے اور ڈاکٹر نے اس کے خلاف استغاثہ دائر کر کے اُسے گرفتار کرا دیا ہے۔ اب وہ مجھے بلا رہا تھا کہ آ کر ضمانت دوں شیداؔ کی طاقتِ لسانی ختم ہو چکی تھی۔ رنگ اُڑا ہوا تھا اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میں نے ضمانت دی اور شیدا صاحب کو پولیس کے چنگل سے نجات ملی۔ بڑی جدو جہد اور مصیبت کے بعد مستغیث "راضی نامہ" پر آمادہ ہوا اور مقدمہ عدالت سے واپس لیا گیا۔

اب شیداؔ صاحب نہایت چُپ چاپ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بہت کم بولتے ہیں۔ سماج کے خلاف بغاوت کے آثار اُن میں نظر نہیں آتے۔ سنا ہے کہ لاہور کو خدا حافظ کہنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

پہاڑ کی سیر

پہاڑ کی سیر

جولائی کا مہینہ آیا۔ کالج بند ہو گئے۔ طلبہ اپنے اپنے گھروں کو سدھارے ریاض نے اب کی چھٹیاں ہونے سے پہلے اپنے ابّا سے لڑ جھگڑ کر فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مرتبہ اور نہیں تو کم از کم یہ تین مہینے تو پہاڑ پر بسر کریں۔ ریاض کی والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ خود اُسے ہمیشہ نزلے زکام کی شکایت رہنے لگی تھی۔ چھوٹی بہن کی پڑھائی صرف اس لئے چھڑا دی گئی تھی کہ وہ بہت دُبلی پتلی ہے اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر اس نے پڑھائی جاری رکھی تو اور کمزور ہو جائے گی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ گھر کے سب لوگ پہاڑ چلیں تاکہ صحت جو لاہور کی لُو اور گرد و غبار میں رہ کر تباہ ہو چکی ہے۔ کسی نہ کسی طرح بحال کی جائے۔ سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ ڈلہوزی باقی پہاڑوں سے بہتر رہے گا۔ لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ ڈلہوزی کی آب و ہوا اکسیر ہے۔ رہنے کے مکان اور کھانے پینے کی چیزیں سستی ہیں اور یوں بھی لاہور سے قریب ہے۔

جب یہ کنبہ روانہ ہوا تو چھوٹے بڑے سب خوشی کے مارے پھٹے پڑتے تھے۔ پہاڑ۔ پہاڑ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ ریاض کا خیال تھا کہ وہ وہاں سے سیب کی طرح سُرخ ہو کر آئے گا۔ ریاض کے والد یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ چلو پہاڑ پر خرچ تو زیادہ ہو گا لیکن لاہور میں جو آئے دن ڈاکٹروں کی فیسیں دے دے کر

اور دوائیں خرید خرید کر روپیہ برباد ہو رہا تھا اُس سے نجات مل جائے گی۔ بچے سب تندرست ہو جائیں گے۔ ریاض کی والدہ کی صحت درست ہو جائے گی۔ اور خود اُن کی کھانسی بھی رفع ہو جائے گی اور واپس لاہور آ کر کم از کم دو سال تک اُنہیں ڈاکٹروں اور حکیموں کی ضرورت نہ رہے گی۔

چلنے سے کئی دن پہلے گھر میں کافی گہما گہمی رہی۔ صندوقوں سے گرم کپڑے نکال نکال کر دُھوپ دکھائی جا رہی تھی۔ بستروں میں لحاف، توشک اور کمبل رکھے جا رہے تھے۔ ریاض کی والدہ نے بازار سے ایک بوری چاولوں کی، ایک بوری آٹے کی اور ایک کنستر گھی کا منگوا لیا۔ ایک بہت بڑے ٹوکرے میں کھانے پکانے کے برتن بند کر لئے۔ ریاض کے والد نے دبی زبان میں کہا بھی کہ "اس قدر سامان کی کیا ضرورت ہے۔ یہ چیزیں تو وہاں بھی مل سکیں گی"۔ لیکن خانہ داری کے معاملات میں عورتیں مردوں کی رائے کو اہمیت دینے کی عادی نہیں چنانچہ ریاض کی والدہ اس بات کے جواب میں خاموش ہی رہیں۔

رات کے گیارہ بجے کی گاڑی سے جب یہ قافلہ روانہ ہوا تو بستروں کے بڑے بڑے بنڈل، کپڑوں سے بھرے ہوئے صندوق، آٹے اور چاول کی بوریاں، برتنوں کے ٹوکرے، گھی کے کنستر اور اسی قسم کا الغم بلغم دیکھ کر ریاض کے والد بوکھلا سے گئے۔ خود ریاض کو سخت غصہ آیا۔ لیکن وہ پہاڑ کی خوشی میں یہ کڑوا گھونٹ بھی پی گیا۔ گاڑی کے درمیانے درجے میں جہاں یہ لوگ سوار تھے بہت

بھیڑ تھی۔ بیٹھنے کو جگہ تو مل گئی لیکن سونا ممکن نہ تھا۔ رات بھر سبھی اونگھتے رہے۔ اس خیال سے کہ سامان میں سے کوئی چیز اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ ریاض کے والد نے جاگتے رہنے ہی کو ترجیح دی۔ صبح چار بجے پٹھانکوٹ کا اسٹیشن آیا اور وہاں سے پانچ بجے کے قریب ڈلہوزی جانے والی لاری روانہ ہوئی۔

موسم میں تبدیلی تو پٹھانکوٹ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن دس میل آگے جا کر بارش شروع ہو گئی اور سرد ہوا سے دانت بجنے لگے۔ ریاض وہی معمولی سرد کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ڈلہوزی پہنچتے پہنچتے اُسے تو زور کا بخار چڑھ گیا۔ راستے میں جب لاری چکر کاٹ کر پہاڑی راستہ طے کر رہی تھی تو ریاض کی والدہ اور اُس کی دونوں بہنوں کو متلی شروع ہو گئی۔ اُن کی حالت قابلِ رحم تھی۔ بچاری بُرقع اُٹھا کر کھڑکی سے باہر منہ نکالے قے پر قے کئے جاتی تھیں۔ طبیعت ہلکان ہو رہی تھی اور سر پیر کا ہوش نہ رہا تھا۔ ریاض کی والدہ تو آخر نڈھال ہو کر لاری کے بنچ پر ہی گر گئیں ریاض کے والد پریشان تھے کہ یہ کس مصیبت میں پھنس گئے۔ کبھی ریاض کی نبض پر ہاتھ رکھتے۔ کبھی اُس کی والدہ اور بہنوں کو حوصلہ دیتے۔ ڈلہوزی پہنچ کر ریاض کی والدہ اور اُس کی بہنوں کی طبیعت تو درست ہو گئی لیکن ریاض کا بخار اور تیز ہو گیا۔

ریاض کے والد کے ایک دوست نے اُن کے لئے مکان کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ریاض کے والد نے اُسے بار بار تاکید کی تھی کہ مکان اچھی جگہ واقع ہو، ہوادار ہو، کشادہ ہو اور کرایہ زیادہ نہ ہو۔ لیکن وہ غریب انتہائی کوشش کے باوجود

بھی ان خوبیوں کا مکان ڈھائی سو روپے سے کم میں حاصل نہ کر سکا۔ ڈھائی سو کا لفظ سنتے ہی ریاض کے والد اور اُس کی والدہ کا رنگ فق ہو گیا لیکن اب صبر اور شکر کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

پہاڑ پر پہلی رات اُنھوں نے جس طرح بسر کی اُس کی کیفیت یہ ہے کہ سب نے مل کر رتجگا منایا۔ پہاڑ کی خوشی میں نہیں بلکہ کھٹملوں کی جان کو روتے ہوئے کبھی آدھ گھنٹہ کے لئے آنکھ لگتی تو دفعتہً جسم میں نشتر سا چبھ جاتا اور سونے والا تڑپ کر اُٹھ بیٹھتا تھا۔ صبح ہوئی تو سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ سوچتے تھے کہ یا اللہ کیا پہاڑ کے یہی مزے ہیں۔ صبح و شام بارش کا تانتا لگا رہتا تھا اور کئی مرتبہ دو دو دن سورج نظر نہ آتا تھا۔ ریاض کے والد کی کھانسی بڑھ گئی۔ ریاض کی بہن کے جسم پر کھٹملوں نے کاٹ کر چھوٹی چھوٹی پھنسیاں پیدا کر دی تھیں وہ ہر وقت کھجلاتی رہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان پھنسیوں نے زخموں کی صورت اختیار کر لی۔ اب بچاری کے لئے ڈاکٹر کی دُکان سے مرہم منگایا گیا جس کے مسلسل استعمال سے بھی فائدہ نہ ہوا۔ اور فائدہ ہوتا کیونکر۔ کھٹملوں کی یورش بدستور جاری تھی اور اُس کی خارش رُکتی نہ تھی۔

لاہور میں اس موسم میں آموں کی فصل زوروں پر تھی۔ لیکن ڈلہوزی میں آم دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور ملتا بھی تو اس قدر مہنگا کہ خریدتے ہوئے جی ڈرتا تھا۔ سیب تھے تو وہ مہنگے۔ ناشپاتیاں تھیں تو وہ مہنگی۔ اور کسی قسم کا پھل نظر نہیں آتا تھا۔ ریاض

کی والدہ کفایت شعاری کی پابند تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ خرچ زیادہ نہ ہو۔ اُن کا دن بھر انہی کاموں میں گذر جاتا تھا جو لاہور میں اُن کا معمول تھا۔ باورچی خانے کا انتظام، بچوں کا رکھ رکھاؤ، کپڑوں کی دیکھ بھال۔ ریاض کے والد بہتیرا کہتے کہ "بھئی، پہاڑ پر تو لوگ اس لئے آتے ہیں کہ صبح و شام سیر کریں۔ تم گھر کے دھندوں کو اب کچھ وقت کے لئے چھوڑ دو۔"

ریاض کی والدہ بے دلی سے جواب دیتیں "آپ جی کھول کر سیر کیجئے۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ پہاڑ پر بیٹھی ہوں۔"

ریاض کو ایک روز پہاڑ پر چڑھتے ہوئے پتھر لگ جانے سے پاؤں میں معمولی چوٹ آگئی۔ دو، ایک روز وہ اسی حالت میں گھومتا رہا جس سے زخم اچھا ہونے کے بجائے اور پھیل گیا۔ اب اُس نے مجبوراً باہر چلنا پھرنا ترک کر دیا۔ بارش ہر روز ہوتی تھی۔ اس لئے معمولی سا زخم جو لاہور میں شاید دو دن کے اندر ٹھیک ہو جاتا۔ یہاں آٹھ دس دن لے لیتا تھا۔ ریاض گھر میں پڑا پڑا سخت بے چین ہو رہا تھا۔ وہ دن بھر گھومنے کا عادی تھا۔ اُسے یہ خانہ نشینی قید سے کم نہ تھی۔

ایک شخص کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پہلی مرتبہ کلکتہ گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ چھ آنے کا سیزن ٹکٹ خرید کر انسان صبح چھ بجے سے رات کے دس بجے تک ٹرام میں گھوم سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے کلکتہ دیکھنے کا یہ طریقہ بہتر خیال کر کے ایک روز سیزن ٹکٹ خرید لیا اور صبح سات بجے ٹرام میں سوار ہو گیا۔ دوپہر تک وہ ٹرام

میں چڑھا کبھی اس بازار میں اور کبھی اُس سڑک پر چکر لگاتا رہا۔ جب دو بجے تو اُس کے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں درد بڑھ گیا۔ اب اس نے چاہا کہ ٹرام سے اُتر کر اپنی قیام گاہ پر جا کر آرام کرے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال ستانے لگا کہ اس کا ٹکٹ بے کار جائے گا۔ وہ رات کے دس بجے تک ٹرام میں بیٹھنے کا مجاز تھا۔ ابھی اڑھائی بجے تھے۔ اگر وہ اِسی وقت اُتر گیا تو آدھے دن کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ چنانچہ وہ درد سے کراہتا رہا۔ اور ٹرام میں بیٹھا شام تک گھومتا رہا۔

قریب قریب اِس واقعہ سے ملتی جُلتی کیفیت ریاض کے والد کی تھی۔ وہ اس بات کا تہیہ کر کے آئے تھے کہ پہاڑ پر اپنی صحت بحال کر کے رہیں گے۔ انہوں نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ پہاڑ کے مزے اسی طرح اٹھائے جا سکتے ہیں کہ انسان باہر پھرتا رہے چنانچہ وہ صبح ہی گھر سے نکل جاتے تھے۔ ناشتے کے وقت واپس آتے اور کچھ دیر آرام کرتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر پھر نکل جاتے اور دو ایک گھنٹے باہر پھرتے رہتے تھے۔ شام کو پھر سیر کا پروگرام مقرر تھا۔ اُن کا بوٹ نیا تھا جس نے اُن کے پاؤں میں چھالے ڈال دیئے لیکن یہ مردِ خدا اپنی دُھن کا پکا تھا۔ اُس کے پیشِ نظر صرف صحت تھی۔ بعض دوستوں نے منع کیا کہ کھانا کھا کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھنا نقصان دہ ہے۔ اس طرح ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔ لیکن وہ ہنس کر کہتے "اگر پہاڑ پر آ کر بھی سیر نہ کی تو پھر سیر کہاں کریں گے"۔

دوپہر کے کھانے کے بعد روزانہ بلندی پر جانے کا آخر نتیجہ نکل آیا۔ ریاض کے والد کو یکایک دست شروع ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا یہ ہِل ڈائیریا ہے۔ چند روز کے آرام اور علاج سے فائدہ تو ہوا لیکن آنتوں اور معدے کے اندر ایسا فتور ہو گیا تھا کہ ریاض کے والد اگر پون ایک گھنٹہ بھی پیدل پھرتے تو مرض لوٹ آتا تھا۔ انہوں نے چلنا پھرنا بہت کم کر دیا۔ لیکن بیماری کا پوری طرح ازالہ نہ ہو سکا۔ اب اُن کا زیادہ وقت گھر کے اندر پلنگ پر لیٹے یا آرام کرسی پر بیٹھے گذرتا تھا۔ چند ہی روز میں اُن کے چہرے کی رونق اور جسم کی توانائی کم ہو گئی۔ کھانے پینے میں بہت پرہیز کرنا پڑتا تھا۔ دوا بھی باقاعدہ استعمال ہو رہی تھی۔ اُن کی طبیعت آہستہ آہستہ پہاڑ سے بیزار ہونے لگی۔ وہ سوچتے تھے کہ اس سے تو لاہور اچھا تھا۔ بلا سے گرمی تھی تو کیا ہوا۔ یوں لنگڑے لُنجے اُپاہجوں کی طرح گھر میں تو بیٹھنا نہیں پڑتا تھا۔

ریاض کی والدہ نے دیکھا کہ خرچ دُگنا ہو رہا ہے۔ ریاض کے والد کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ بچیاں اُداس اُداس نظر آتی ہیں تو خود اُس کا جی بھی پہاڑ سے اُچاٹ ہو گیا۔ لاہور میں تو یہ حالت تھی کہ محلّے میں گھر تھا۔ عزیز دل، رشتہ دار دل، ملنے والوں کا پڑوس تھا۔ غمی خوشی کی خبریں ہر وقت ملتی رہتی تھیں اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ کسی شناسا کی صورت دیکھنے میں نہ آتی

تھی۔ ریاض اور ریاض کے والد کے ملاقاتی تو کافی تھے لیکن وہ باہر ہی آپس میں ہنس بول لیتے تھے۔ ریاض کی بہنوں نے اِس اُداسی اور تنہائی کو شدت سے محسوس کیا۔ لاہور میں اُن کی بہت سی سہیلیاں تھیں جن سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ چھٹی کے روز یہ کسی سہیلی کے ہاں چلی جاتی تھیں یا کوئی سہیلی اِن کے ہاں آجاتی تھی اور تمام دن گویا آنکھ میں جھپکنے میں گذر جاتا تھا۔ دو گھڑی سینا پرونا کر لیا۔ کچھ دیر پڑھائی کر لی، پھر گیند کھیلنے لگ گئیں اور ساتھ ساتھ ہنسی دل لگی کی باتیں بھی کرتی رہیں لیکن یہاں ڈلہوزی میں تو کسی سہیلی کی صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔

ریاض کی چھوٹی بہن کو اُس کی ایک ہم جماعت لڑکی نسیمہ کا لاہور سے خط آیا کہ اُس کے بھائی کی شادی ہو گئی ہے۔ اُس نے شادی کی پوری تفصیل لکھ کر بھیجی تھی۔ کیوں کر اُن کے ہاں مہمانوں کی کثرت ہوئی۔ شادی سے کئی روز پہلے ڈھولک بجتی رہی۔ نئے کپڑے اور زیور پہنے گئے۔ آتش بازی چھوڑی گئی۔ برات شان و شوکت سے دلہن کے ہاں گئی۔ پھر دلہن کی آمد کی کیفیت اُس نے حد درجہ معصومانہ لیکن دلچسپ انداز میں لکھی تھی نسیمہ کا مکان ریاض کی بہن کے مکان کے قریب ہی تھا۔ ریاض کی بہن یہ خط پڑھ کر بہت افسردہ اور غم ناک ہو گئی۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ لاہور میں ہوتی تو شادی کے دلچسپ ہنگامے میں شریک ہو کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی۔ یہاں کیا رکھا

تھا۔ اُداسی، تنہائی اور ہمچو ریاض کی بہنوں نے اپنی ماں سے تقاضا شروع کر دیا کہ لاہور چلو۔ ریاض کے والد سوچتے تھے کہ اگر ابھی واپس چلے گئے تو ستمبر کے مہینے کا مکان کا کرایہ جو پیشگی ادا کر دیا تھا ضائع جائے گا۔ ریاض کی والدہ نے کہا "بلا سے مکان کا کرایہ جاتا ہے تو جانے دیجئے۔ بچّے اُداس ہو گئے ہیں۔ خود میرا جی نہیں لگتا۔ صحت الگ خراب ہو رہی ہے۔ چلو واپس چلیں"۔

سامان باندھا گیا۔ لیکن سامان باندھتے وقت سب کے دل پر بوجھ سا تھا۔ کہاں وہ لاہور سے روانہ ہوتے وقت ولولے اور جوش اور کہاں اب واپسی کے وقت شکست خوردہ فوج کی سی پژمردگی۔ ڈلہوزی سے پٹھانکوٹ تک لاری میں آتے ہوئے پھر چکر آئے۔ ریاض کی والدہ اور بہنوں کو بُری طرح متلی ہوئی۔ شام کے وقت یہ قافلہ لاہور پہنچا۔ ریاض کے والد کے دوست احباب اُن کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر بار بار پوچھتے "حضرت! آپ کو کیا ہوا۔ اچھے بھلے یہاں سے گئے تھے۔ وہاں سے مُردہ بن کر واپس آئے۔ ڈلہوزی پہاڑ تھا یا دوسرا جہان تھا جہاں آپ کو اس دنیا کا حساب کتاب دینا پڑا؟"

ریاض کے والد ہنس کر کہتے "بھئی۔ اپنی اپنی طبیعت ہے نا۔ ہمیں تو پہاڑ کی آب و ہوا راس نہیں۔ سچی بات ہے چھجو بھگت!

جیسا مزا چُبارے۔ نہ بلخ نہ بخارے۔

رُوحوں کا تماشا

رُوحوں کا تماشا

میرے دوست منظور احمد ہاشمی تین سال سے انگلستان میں تھے پہلے سنا تھا کہ وہ کیمبرج میں فلسفہ کی ڈگری کی تیاری کر رہے ہیں۔ پھر سُنا کہ انہوں نے کیمبرج کا خیال ترک کر دیا ہے اور لنڈن میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں اور عنقریب بیرسٹر بن کر وطن آیا چاہتے ہیں۔ دو سال اور گذر گئے اور ہاشمی صاحب بدستور انگلستان میں براجمان رہے۔ ولایت جانے سے پہلے میرے اور ہاشمی کے دوستانہ مراسم تو ضرور تھے لیکن اس قدر گہرے نہ تھے کہ میں اس بات کی اُمید رکھتا کہ وہ انگلستان سے برابر خط بھیج کر مجھے اپنے حالات سے آگاہ کرتا رہے گا۔ اس لئے اُس کے متعلق جتنی اطلاعیں مجھ تک پہنچتی رہیں۔ سب اُس کے رشتہ داروں کے ذریعے سے آتی تھیں۔

میں نے جب بھی ہاشمی کے والد سے دریافت کیا کہ "ہاشمی اتنی مدت سے انگلستان میں کیا کر رہا ہے"۔

تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ "کیمبرج سے فلسفہ کی ڈگری حاصل نہ کر سکنے کے سبب بچارے کو بہت سا وقت ضائع کرنا پڑا۔ اب لنڈن میں ہے اور انشاءاللہ جلد ہی قانون کی تعلیم ختم کر کے واپس آئے گا"۔

آخر ساڑھے پانچ سال کی جدائی کے بعد ہاشمی نے دوبارہ شکل دکھائی۔ اُس کے پاس سوائے بیرسٹری کے اور کوئی تعلیمی سند نہ تھی۔ اگرچہ وہ بہت خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اس بات کی اسے چنداں پروا نہ تھی کہ وکالت کے پیشے سے روپیہ کمائے لیکن پھر بھی ضروری تھا کہ زمانے کی روش کے مطابق اور سوسائٹی میں معقول جگہ پانے کے لئے وہ پریکٹس جاری کر دے۔ جالندھر اُس کا وطن تھا اور روزمرہ کی جتنی سہولتیں انسان کو وطن میں میسر آسکتی ہیں سب اُسے حاصل تھیں۔ اس لئے اُس نے جالندھر میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ میں بھی اتفاق سے اُن دنوں وہیں تھا۔ ہاشمی نے شہر سے باہر ایک پُر فضا کوٹھی میں اپنے رہنے کا انتظام کیا۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد ہاشمی میں میں نے ایک خاص تبدیلی محسوس کی۔ ولایت جانے سے پہلے اُسے زندہ دلی اور ہنسی مذاق کی بہت عادت تھی اور اب وہ عادت کم ہو گئی تھی۔ اس کی بجائے اُس میں خاموشی اور غور و فکر کا مادہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید مغربی تعلیم و تربیت کا یہی اثر ہو گا۔

کہنے کو تو ہاشمی نے پریکٹس شروع کر دی لیکن وہ اس کام میں چنداں دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ کچہری جاتا ضرور تھا لیکن یوں ہی ضابطے کی خانہ پُری کے لئے باقی وقت وہ گھر پر مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔ روز بروز اُس کی تنہا رہنے کی عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم سب حیران تھے کہ لوگ انگلستان سے آتے ہیں تو خوش و

خرم ہوتے ہیں اور آپس میں ربط ضبط اور میل جول کے طریقے سیکھ کر آتے ہیں اور ایک یہ ہاشمی ہے کہ مردم بیزار بن کر واپس آیا ہے۔ مختلف قسم کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہاں کسی عورت سے دل لگا آیا ہے اور اب اُس کی یاد میں رو رو کر دن گذار رہا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہو نہ ہو کسی میم سے شادی کر چکا ہے اور اب ماں باپ کے ڈر سے زبان نہیں کھولتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

ایک روز ہم دونوں علحدہ بیٹھے تھے۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ باتوں باتوں میں اُس کے دل کا راز معلوم کروں کہ وہ خود ہی بول اُٹھا۔

کہنے لگا "روحوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "روحوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

اُس نے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح زندہ رہتی ہے اور اِس دُنیا میں آکر ہمارے ساتھ باتیں کر سکتی ہے؟"

میں نے حیران ہو کر ہاشمی کی طرف دیکھا اور کہا "میں نے کبھی اس مسئلہ پر غور نہیں کیا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں ایک مادہ پرست سا انسان ہوں میرا خیال ہے کہ روح کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ یہ تمام ڈھکوسلہ ہے"

ہاشمی نے بگڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا "ہرگز نہیں۔ تم کیسے کہتے ہو کہ روح کا وجود نہیں ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مُردوں کی روحوں کو دیکھا ہے اور اپنے کانوں سے اُن کی آوازیں سُنی ہیں۔ انگلستان میں سائنس اور فلسفہ کے بڑے بڑے فاضل روحانیات کے ماہر ہیں۔ وہ لوگ جو کسی زمانے میں روحوں کے مُنکر تھے۔ اب روحوں پر ایمان لا رہے ہیں۔ وہاں تو یہ حالت ہے کہ علم الحیوانات اور علم النباتات کی طرح علم الارواح بھی سائنس کی ایک مستند شاخ بن چکی ہے۔ باقاعدہ تجربے ہوتے ہیں۔ خاص قسم کے آلات کے ذریعے سے روحوں کی تصویریں اُتاری جاتی ہیں۔ اُن سے گفتگو کی جاتی ہے اور آئے دِن اس علم کے متعلق نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "تو معلوم ہوتا ہے کہ تم وہاں پانچ ساڑھے پانچ سال قانون اور فلسفہ کی تعلیم کا بہانہ بنا کر دراصل روحانیات کا علم سیکھتے رہے ہو اور اب لوگوں سے الگ تھلگ ہر وقت گوشۂ تنہائی میں گھُسے ہوئے انہی روحوں کے متعلق تجربے کرتے رہتے ہو۔"

ہاشمی نے اپنی صورت کو زیادہ متین بنا کر کہا "اس میں ہنسی کی کوئی بات نہیں۔ میں نے انگلستان میں جو کچھ دیکھا ہے وہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ میری آنکھیں کھُل گئیں —— خدا کے لئے ہنسو نہیں۔ مجھے اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جب میں نیا نیا لنڈن گیا تو مجھے ایک نہایت شریف گھرانے

میں رہنے کو جگہ ملی۔ اس خاندان کے کُل چار افراد تھے۔ خاوند، بیوی ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ چند مہینے تو ان لوگوں کے ساتھ میری رسمی سی ملاقات رہی۔ پھر آہستہ آہستہ بے تکلفی ہو گئی۔ ان کے درمیان آپس میں ہر وقت روحوں کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ رات کا کھانا کھا کر گول کمرے میں آتش دان کے قریب بیٹھتے تو ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ایسا رسالہ یا اخبار ضرور ہوتا تھا جس میں روحوں کے حالات درج ہوں۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا دیوانگی ہے کہ ہر وقت روحوں کے قصّے بیان کئے جاتے ہیں۔ فلاں روح آئی اور فلاں روح چلی گئی۔ اُس روح نے یہ کہا اور اس روح نے یہ سنا۔ مجھے یہ تمام باتیں لغو معلوم ہوتی تھیں اور میں تعجب کرتا تھا کہ انگلستان جیسے روشن خیال ملک میں بھی لوگ اس قسم کی خرافات پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ایک روز گھر کی مالکہ نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ کو روحانیات سے دلچسپی نہیں ہے؟"

میں نے بمشکل ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "میں اس قسم کی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا۔"

گھر کی مالکہ نے بہت دردمندی کے لہجے میں جواب دیا "ہم لوگ بھی شروع شروع میں یہی خیال کرتے تھے لیکن تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ روحوں کا وجود ہے۔ وہ ہمارے گرد وپیش ہر وقت چکر لگاتی رہتی ہیں۔ وہ ہم سے باتیں کرنے کی خواہاں ہیں اور ہمارے دُکھ درد کو ہر گھڑی محسوس کرتی ہیں۔ آپ

شاید نہیں جانتے کہ علم الارواح سے دلچسپی رکھنے والوں کی یہاں ایک نہایت معتبر کلب ہے۔ اس کلب کا جلسہ ہفتہ میں ایک بار بُدھ کے روز ہوتا ہے۔ ہم لوگ اُس میں شرکت کرتے ہیں۔ آپ بھی کسی دن ہمارے ساتھ چلیے اور پھر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ اگرچہ غیروں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں لیکن کلب کے ممبر اپنے مخلص دوستوں کو ہمراہ لا سکتے ہیں۔"

اس ادھیڑ عمر شریف خاتون کی یہ باتیں سُن کر میں دل میں ہنسا۔ لیکن بظاہر میں نے جلسہ میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ بُدھ کے روز شام کے وقت میں کنبے کے باقی افراد کے ہمراہ اس کلب میں گیا۔ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف مختصر سی اسٹیج تھی اور سامنے ستر اسّی آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ حاضرین سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ روشنی مدھم تھی جس سے فضا میں اُداسی اور غمگینی پھیل رہی تھی۔ ہم چُپکے سے پچھلی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ میرے قریب ہی میری میزبان خاتون بیٹھی تھیں۔ اتنے میں دو آدمی اسٹیج پر آئے۔ ایک تو کُرسی پر بیٹھ گیا اور دوسرا اُس کے قریب چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ پانچ ایک منٹ کے بعد کُرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنے قریب کھڑے ہونے والے شخص کی طرف اشارہ کیا اور اس کا نام لے کر کہا کہ "آج یہ صاحب کارروائی شروع کریں گے۔"

تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی کہ اُس شخص نے بلند آواز میں مختلف روحوں کے

پیغام اُن کے عزیزوں کو جو اُس جلسے میں موجود تھے۔ سنانا شروع کیے۔ ایک بوڑھے کو اُس کے لڑکے کا جو جنگ میں مارا گیا تھا پیغام سنایا۔ ایک نوجوان لڑکی کو اُس کی ماں کی روح نے محبت بھرا پیغام بھیجا تھا۔ ایک نوجوان کو اُس کی محبوبہ کی روح کا بہت رقت آمیز پیغام آیا تھا۔

میں یہ ماجرا دیکھ رہا تھا اور دل میں شک و شبہ پیدا ہو رہا تھا میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ نداق ہے کہ یکایک اسٹیج پر کھڑے ہوئے شخص نے اپنا دہنا ہاتھ اُٹھا کر میری طرف اشارہ کیا اور کہا "آپ ہندوستانی صاحب جو پچھلی نشست پر بیٹھے ہیں۔"

اُس کا اتنا کہنا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا خوف کے مارے میں بے ہوش ہونے لگا ہوں اور پھر اُس نے ایک ایسی ہستی کا پیغام مجھ کو سنایا جو کسی زمانے میں مجھے دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب تھی اور جو اُس وقت انگلستان سے ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر ہندوستان کے ایک دُور افتادہ گوشے میں زمین کے نیچے دفن تھی۔

بس اس واقعہ سے میری زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا اور اُس وقت سے میں نے روحانیات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے میں اُس کلب کا ممبر بنا۔ اُس کے جلسوں میں شریک ہونے لگا اور پھر آہستہ آہستہ مجھ پر ایسے رموز منکشف ہونے لگے کہ میرے خیالات ہر روز بدلتے چلتے گئے۔ دنیا میں دو

قسم کی روحیں ہیں۔ نیک روحیں اور بد روحیں۔ ارواح خبیثہ کا ہندوستان میں بہت چرچا ہے۔ یورپ میں علم الارواح کے ماہروں نے ابھی اس طرف توجہ نہیں کی میرا ارادہ ہے کہ ارواحِ خبیثہ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر کے مغربی لوگوں کو اُن سے روشناس کروں"۔

جب ہاشمی نے بات ختم کی تو میں نے کہا کہ "جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سب تمہاری خوش فہمی کی دلیل ہے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ اِن فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ یہ سب فریب ہے۔ اور جو کچھ تم نے بیان کیا ہے مجھے اس کے پچاسویں حصے پر بھی اعتبار نہیں"۔

یہ سُن کر ہاشمی مجھ سے ناراض ہو گیا۔ لیکن چند ماہ کے اندر اندر سارے شہر میں ہاشمی کے اس خبط کا چرچا ہونے لگا۔ ہر شخص تعجب کرتا تھا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی کس جنون میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اُس کا وہم یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ جون جولائی کی گرمیوں میں دوپہر کے وقت وہ قبرستانوں میں جا جا کر چکر لگایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ دن کے عین بارہ بجے جب دھوپ کی شدت سے تنگ آ کر حیوان بھی غاروں میں گُھسے ہوئے تھے، شہر سے باہر اُجاڑ بیابان میں تن تنہا پھر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اُس کا نام لے کر آواز دی۔ خوف سے ہاشمی کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا کہ بیری کے درخت پر ایک نہایت خوفناک صورت بڑھیا بیٹھی ہے۔ اُس کے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں سر کے بال کُھلے ہیں جسم پر چیتھڑے

لٹک رہے ہیں اور ہنس ہنس کر اُسے آوازیں دے رہی ہے۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ہاشمی کی بے ساختہ چیخ نکل گئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اُٹھا۔ پیچھے سے بڑھیا کی خوفناک آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔

ہاشمی گھر پہنچا تو اُس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ ڈر کے مارے اُسے اِس زور کا بخار چڑھا کہ کئی روز تک جان کے لالے پڑے رہے۔

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر کے بعض ستم ظریف لوگوں نے ہاشمی کے خبط کا تماشا دیکھنے کے لئے ایک بڑھیا کو سکھا پڑھا کر جنگل میں لا بٹھایا تھا۔

زندگی کی صبح

زندگی کی صبح

سالہا سال سے وہ اس لائبریری میں کام کر رہا تھا۔ منحنی سا جسم اوسط درجے سے ذرا نکلتا ہوا قد، روشن آنکھیں جن سے ذہانت مترشح تھی، چوڑی پیشانی جو سر کے بال اُڑ جانے سے بالکل سر کے ساتھ مل گئی تھی، بڑے بڑے کان، چہرے کی رنگت سیاہ، کن پٹیوں کے بالوں میں سفیدی کا بڑا سادہانہ، بیٹھی ہوئی ناک، یہ تھا مختصر سا حلیہ جگدیش کا جو پندرہ سال سے کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ ہر روز صبح کالج آنا اور دن بھر کام میں مصروف رہ کر شام کو خاموشی سے گھر لوٹ جانا اُس کا معمول تھا۔ اِس باقاعدگی میں شاذونادر ہی ناغہ ہوتا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ چھٹی کے روز گھر بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تو اُٹھ کر لائبریری چلا آیا۔ کالج بند ہے عظیم الشان عمارت کے کسی گوشے سے بھی انسان کی آواز نہیں آتی اور وہ ایک وسیع و عریض ہال میں جہاں آگے پیچھے، دائیں بائیں، ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی ہیں ایک کونے میں گردن جھکائے کسی ضخیم سی جلد کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ علم و ادب کی اِس پُرسکون فضا میں، کتابوں سے بھری ہوئی اونچی اونچی الماریوں کے درمیان، گردوپیش کے پاکیزہ تاثرات کے ماتحت جب وہ عالم تنہائی میں

میں کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق ہوتا تو اُسے یکایک یوں محسوس ہوتا گویا اُس کی روح زمان و مکاں کی قید سے بے نیاز ہو کر خود مصنف کی روح سے پیوست ہو گئی ہے۔ اب اِس عالمِ خود فراموشی میں وہ اپنے ماحول سے یکسر بے خبر کبھی ڈانٹے اور بیٹریس کے ساتھ محوِ گلگشت ہے کبھی حافظ و خیام کے ساتھ رنگ و بو کی محفلیں برپا کر رہا ہے۔ کبھی شیلے اور بائرن کی صحبت میں نئے زمین و آسمان کی تعمیر میں منہمک ہے۔ پھر خود ہی ایک ہچکی سے جاگ اُٹھتا تھا۔ ہزار برس پہلے کے مصنف اُس کے دوستوں کی طرح جیتے جاگتے انسان بن گئے تھے۔ اُس نے اُن سے اس قدر ربط و ضبط بڑھا لیا تھا کہ وہ گویا اُن کی آواز سنتا اور ان کی موجودگی کو محسوس کرتا تھا۔

جگدیش کو ادبیات سے عشق تھا۔ انگریزی کے علاوہ فارسی، اُردو اور بھاشا پر بھی اُسے قابلِ رشک عبور تھا۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اُس کی زندگی ایک ہی روش پر چلی جا رہی تھی۔ ریتلے میدانوں میں خاموشی سے بہنے والی ندی کی طرح جو شور و شیون سے بے خبر ہو۔ اُس کے ایامِ حیات بھی ہر قسم کے طوفان سے نا آشنا دھیمے دھیمے گذر رہے تھے۔ آبادی سے کچھ فاصلے پر ایک مختصر سا مکان تھا جس میں تین کمرے اور ایک صحن تھا۔ دس برس سے وہ اِس مکان میں مقیم تھا۔ اس سے پہلے وہ شہر میں رہتا تھا لیکن شہری زندگی کے ہنگاموں سے بہت جلد اُسے نفرت ہو گئی تھی۔ اُس کے تخیل

کی دنیا کانچ کے نازک برتن کی طرح تھی جو ذرا سی ٹھیس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اُس کے مکان میں بھی چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ لباس کے متعلق وہ ہمیشہ بے پروا رہا تھا۔ جاڑوں میں اُس کا دُبلا پتلا جسم ہر وقت ایک لمبے سے کوٹ میں چھپا رہتا تھا۔ کبھی کبھی کسی دوست کے اصرار سے مجبور ہو کر وہ ایک تین چار برس کا پرانا سوٹ پہن لیتا تھا جس پر جگہ جگہ دھبے پڑ گئے تھے۔ بچپن ہی میں وہ ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ اُس کے چچا اُس کے نگراں رہے لیکن اُن کے انتقال کے بعد وہ زندگی کے کارزار میں بالکل یکہ وتنہا رہ گیا تھا۔ محض اپنی ہمت سے وہ آگے بڑھتا رہا۔ اُس کا شوق ہی کشمکشِ حیات میں اُس کا سب سے بڑا رہنما تھا۔ دسویں جماعت کے بعد حالات کی نامساعدت نے اُسے تعلیم ترک کر دینے پر مجبور کر دیا لیکن ناتمامی کا یہ داغ ہمیشہ اُس کے دل و دماغ پر تپتے ہوئے انگارے کی طرح چمکتا رہا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر اُسے تعلیم جاری رکھنے کے وسائل میسّر آ جاتے تو شاید اپنی ذہنی استعداد کو مزید جلا دے کر وہ زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل جاتا۔ اب اس کمی کو پورا کرنے کی صرف یہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ تقدیر کی ستم آرائیوں کے باوجود محنت و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ چنانچہ جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اُس نے ایک اسکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ ہر چند کہ ملازمت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے بعد اُس کے پاس

فرصت کا بہت تھوڑا وقت رہ جاتا تھا لیکن یہ پابندیاں اُس کے شوق کی تکمیل کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ اُس کے دن رات مطالعہ میں بسر ہونے لگے۔ اسکول کی چھوٹی سی لائبریری کی تمام کتابیں ایک ایک کر کے اُس کی نظر سے گذر گئی تھیں۔ اپنی قلیل تنخواہ میں سے جو بہ مشکل اُس کی ضروریات کی کفالت کرتی تھی وہ ہر مہینے کچھ روپے بچا کر نئی کتابیں خرید لیتا تھا۔ زندگی کا میدان اُس کے لئے بہت محدود اور مستقبل کی ترقی کے امکانات بے حد مخدوش تھے۔ لیکن وہ ان اندیشوں میں مبتلا ہوئے بغیر چپکے سے اپنی دُھن میں لگا رہا۔ آہستہ آہستہ اُس کی نظر میں وسعت، خیالات میں عمق اور جذبات میں توازن پیدا ہونا شروع ہوا۔ علم کی روشنی نے اُسے بہت سے حقائق سے دو چار کر دیا۔ تعصّب اور جہالت کے پردے چاک ہوتے گئے اور وہ اشیا کو اُن کی اصلی حالت میں دیکھنے لگا۔ اُس کے دل و دماغ میں علم کی شعاعوں سے اُجالا ہو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ زندگی کے دنیاوی پہلو سے ہر روز غافل ہوتا جا رہا تھا۔ لباس کی طرف سے بے پروا۔ کھانے پینے کی طرف سے بے احتیاط اور صحت کی طرف سے بے توجہ۔

جگدیش کو اسکول کی ملازمت میں پورے آٹھ سال گذر چکے تھے اس عرصے میں ذہنی استعداد اور دماغی صلاحیّت کے اعتبار سے وہ یقیناً اس مرتبہ کو پہنچ چکا تھا جہاں یونیورسٹی کے بہت کم فارغ التحصیل نوجوانوں

کی رسائی ہوتی ہے۔ ادب کی طرف اُس کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ ہندوستانی اور مغربی ادبیات پر اُسے اچھی خاصی دسترس ہو گئی تھی۔ اردو اور ہندی میں اُس نے مشقِ سخن بھی شروع کر دی تھی۔ اُس کی چند چیزیں بعض رسالوں میں بھی چھپی تھیں۔ اگرچہ اُن ابتدائی نقوش میں جدّت و ذہانت کے وہ قابلِ ذکر اثرات موجود نہیں تھے جنہوں نے بعد میں اس کے کلام امتیازی رنگ دے دیا تھا۔ جگدیش اب ماحول بدلنے کے لئے بے تاب تھا۔ اُس کی بڑھتی ہوئی اُمنگوں اور اس کے تخیل کی روز افزوں پرواز کے سامنے اُس کا قصبہ ایک بہت ہی معمولی بستی بن کر رہ گیا تھا۔ وہ لاہور جانے کے ارادے باندھ رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ علم وفضل کے لحاظ سے لاہور خطۂ یونان سے کم نہیں اُس کی زبردست خواہش تھی کہ شمالی ہند کے اِس سب سے بڑے علمی مرکز میں بیٹھ کر اپنی تشنگی کو بجھائے۔ چنانچہ ایک روز واقعی اُس نے اسکول کی نوکری سے استعفٰے دے دیا اور بوریا بستر باندھ کر لاہور چلا آیا۔ یہاں وہ دو مہینے کے قریب بے کار رہا اور پھر اُسے نیو آیرا کالج کی لائبریری میں جگہ مل گئی۔

جس طرح مچھلی پانی میں جا کر عیش و آرام محسوس کرتی ہے اور پرند دن بھر ہوا میں آوارہ و سرگرداں پھرنے کے بعد شام کو گھونسلے میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ جگدیش کو بھی نیو آیرا لائبریری میں بے پایاں مسرت کا احساس ہوا۔ کتابوں سے لبریز الماریوں کو قطار اندر قطار دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوتا

تھا گویا وہ سونے کی کان میں لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں سے وہ جس قدر چاہے مال و دولت سمیٹ کرلے جا سکتا ہے۔ جب وہ اپنے گرد وپیش علم وادب کے نایاب نسخے، زندہ جاوید شعراء کے دیوان اور مشہور زمانہ ادیبوں کے شاہکار دیکھتا تو صرف اِس بات کا احساس کہ وہ اِن خزانوں سے جی بھر کے متمتع ہو سکتا ہے اُس کے اعصاب میں خوشی کی ایک تھرتھری پیدا کر دیتا تھا۔ وہ گھنٹوں الماریوں کے سامنے کھڑا صرف کتابوں کے نام پڑھ پڑھ کر خوش ہوتا رہتا تھا۔

پندرہ سال سے جگدیش نیو آیرا میں کام کر رہا تھا۔ اُس کے شوقِ مطالعہ اُس کی وسعتِ معلومات اور اُس کے تبحرِ علمی نے اس کو کالج کے علم دوست حلقوں میں مقبول و محترم بنا دیا تھا۔ خود کالج کے پرنسپل اُسے حد درجہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ترقی کرتے کرتے وہ لائبریری کا انچارج ہو گیا تھا۔ پندرہ برس کے اس طویل عرصے میں روئے زمین پر بے شمار انقلابات برپا ہوئے لیکن جگدیش کی یکساں، ہموار اور خاموش زندگی کے حدود میں کوئی انقلابی تحریک بار نہ پا سکی۔ کائنات کو کئی بار زلزلوں، طوفانوں اور کُشت وخون کے ہنگاموں نے ہلا ہلا دیا لیکن جس حصارِ عافیت میں جگدیش بیٹھا زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ وہاں کسی زلزلے اور طوفان کو سر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بچپن کا زمانہ ختم کر کے کالج میں داخل ہوتے۔ حیاتِ

مستعار کے چند سال ضیائے علم سے اپنے دل و دماغ کو منوّر کرتے اور پھر دنیا کی بے پایاں وسعت میں گم ہو جاتے تھے۔ اس طرح نسلِ انسانی کے ہزار دل افراد کالج کی مختصر سی دنیا میں جگدیش کے سامنے سے گذر چکے تھے۔ اُن میں سے بعض خوش قسمت کالج کی چار دیواری سے باہر زندگی کی تگ و دو میں کامیاب و بامراد رہے اور بعض جنہیں زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے مشقِ ستم کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ غم و حرماں کا شکار ہو گئے۔ جگدیش کو جب بھی ان میں سے کسی مصیبت زدہ دوست آشنا سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو وہ درد و محبت کے چند آنسو ضرور بہاتا تھا۔

اپنے مکان میں وہ ابھی تک تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس کے احباب نے کئی مرتبہ شادی کی تحریک کی۔ لیکن جگدیش کو اپنی عزلت نشینی سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا کہ وہ ڈرتا تھا کہ مبادا شادی کے بعد اُس کے تخیلات کا حسین و جمیل قصر پاش پاش ہو جائے۔ اُس کی مونس و غم خوار کتابیں ہر وقت اُس کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہ خیالی دنیا کی تخلیق و تعمیر میں اس حد تک منہمک رہ چکا تھا کہ اب اُسے زندگی کے ٹھوس حقائق سے نفرت نہیں تو بیگانگی ضرور ہو چلی تھی۔ تھوڑے عرصے سے اُس نے ایک مینا پال رکھی تھی۔ ننھی مُنّی سی خوبصورت مینا کا پنجرہ ہر وقت جگدیش کے کمرے میں ایک میز پر رکھا رہتا تھا۔ صبح لائبریری جاتے وقت جگدیش بہت شوق سے اُسے کچھ کھلا پلا کر جاتا تھا۔ شام کو لوٹتا تو آتے ہی اُسے مینا

کی فکر ہوتی تھی۔ اُس کے لئے قسم قسم کی مٹھائیاں بازار سے لانا جگدیش کا ایک محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ خود پنجرے کا دروازہ کھول کر اُس کے لئے ٹھلیا میں پانی اور کھانے کی چیزیں رکھتا تھا۔ جب کہیں باہر جاتا تو اپنے ملازم سے تاکید کر جاتا تھا کہ مینا کا خیال رکھے۔ جگدیش کی عادت تھی کہ گرمی ہو یا سردی رات کو جلد سو جاتا اور پھر دو تین بجے اُٹھ کر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ جونہی رات کی تاریکی چھٹتی اور سپیدۂ سحر کے آثار نمودار ہوتے مینا پکار اُٹھتی تھی "صبح ہو گئی"۔

بس یہ تین لفظ مینا نے کسی نہ کسی طرح یاد کر لئے تھے جنہیں وہ ہر صبح آفتاب کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنی باریک آواز میں دُہراتی تھی۔ جگدیش جو بعض اوقات مطالعہ میں اور بعض اوقات فکرِ سخن میں غرق عالمِ بالا کی پرواز میں مصروف ہوتا تھا یہ آواز سُن کر چونک اٹھتا تھا اور پھر محبت و شفقت سے لبریز آنکھیں اٹھا کر مینا کی طرف دیکھتا جو پیغامبرِ سحر کی حیثیت سے ہر شب کے اختتام پر اُسے یہ نوید مسرت سناتی تھی کہ رات کی تاریکیاں مٹ گئیں اور آفتابِ عالمتاب کی جاں بخش روشنی نے اِس مرتے ہوئے جہانِ آب و گِل کو نئی زندگی عطا کی ہے۔

جگدیش چالیس کی عمر کو پہنچ چکا تھا لیکن اُس کی مصروفیتوں میں سرمو فرق نہ آیا تھا۔ شروع شروع میں اُس کے افکار چند ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن اب مدت سے اُس نے اپنے مضامین کی اشاعت ترک کر دی تھی۔ وہ

جو کچھ لکھتا تھا احتیاط سے جمع کرتا جاتا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ چند سال ٹھہر کر نظم و نثر کے بہت سے مجموعے یکے بعد دیگرے شائع کر کے دنیا کو انگشت بدنداں کر دے۔ وہ اپنے مسوّدوں پر بار بار نظرِ ثانی کرتا تھا۔ فقروں کو کاٹتا اور بڑھاتا تھا۔ الفاظ کی نشست اور محاوروں کی بندش میں ردّ و بدل کرتا رہتا تھا۔ اُسے اپنے زورِ قلم پر اعتماد تھا اور وہ اِس یقین سے ہر وقت مطمئن و مسرور رہتا تھا کہ جب پے در پے اُس کی کتابیں شائع ہونے لگیں گی تو بے اختیار اُس کی شخصیت دنیا کی توجہات کا مرکز بن جائے گی۔ لائبریری میں ہر شخص کے ساتھ جگدیش بہت نرمی سے پیش آتا تھا۔ نو عمر طالب علم کبھی کبھی گستاخیاں کر بیٹھتے تھے لیکن جگدیش کسی حالت میں بھی تہذیب و شائستگی کو ہاتھ سے نہیں دیتا تھا۔ بعض طلبہ کتابوں کے انتخاب میں اُس کے مشورے کی ضرورت محسوس کرتے تو وہ بہت دردمندی سے اُن کی رہنمائی کرتا تھا۔

اِس دوران میں ایک لڑکی سوشیلا بی اے کے سالِ اوّل میں داخل ہوئی۔ سوشیلا متموّل والدین کی تنہا اولاد تھی اور شکل و صورت کے اعتبار سے بھی اس حد تک لاجواب کہ شاید شہر میں اُس کے حُسن و جمال کی چند ہی مثالیں موجود ہوں۔ حسنِ ظاہر کے ساتھ ساتھ قدرت نے اُس کے دل و دماغ کی تشکیل میں بھی خاص اہتمام کیا تھا۔ اُس کا باپ دہلی کا باشندہ تھا لیکن ایک بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے مدّت سے لاہور میں مقیم تھا۔ وہ چونکہ

خود علم و ادب کا دلدادہ تھا اس لئے اپنی اکلوتی لڑکی کی تربیت میں بھی اُس نے علمی و ادبی رجحانات کو اپنا شریکِ حال بنائے رکھا تھا۔ چنانچہ سنِ شعور ہی سے سوشیلا ادبیات میں دلچسپی لینے لگی اور اپنے فاضل باپ کی رفاقت سے اُس کا یہ شوق بڑھتے بڑھتے کافی ترقی کر گیا تھا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوئی تو اُس کا مطالعہ اتنا وسیع اور ذوقِ ادب اتنا پاکیزہ تھا کہ اس کے ہم سبق طلبہ تو الگ خود پروفیسر حیران تھے کہ اِس عمر کی لڑکی کیوں کر اِن مسائل پر عبور رکھ سکتی ہے۔

نیو آیر ا میں سوشیلا کے داخل ہوتے ہی لوگوں نے محسوس کیا کہ کالج کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارہ طلوع ہوا ہے۔ کالج کے ماہانہ رسالے میں اُس کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ علمی مناظروں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ اُس کی تحریر و تقریر کے جادو نے کالج کی محدود دنیا کو اس قدر متاثر و مسحور کر لیا تھا کہ ہر شخص کی زبان پر اُسی کا نام تھا۔ جگدیش بھی خوابِ گراں سے آنکھیں مل کر اٹھا۔ سوشیلا ہر روز دو گھنٹے لائبریری میں صرف کرتی تھی۔ کتابوں کے انتخاب میں اُسے بار بار جگدیش سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ جگدیش اُسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اِس بات کا اعتراف کرنے میں اُسے کوئی تکلف نہیں تھا کہ اپنی ساری ملازمت کے زمانے میں اُس نے سوشیلا سے زیادہ ذہین و خوش گفتار لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بڑی ہمدردی اور توجہ سے اُسے ہر قسم

کا مشورہ دینے کو تیار رہتا تھا۔ کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ ہو یا کسی علمی مضمون کی تیاری کا سوال جگدیش سوشیلا کی ہر ممکن مدد کے لئے آمادہ ہو جاتا تھا۔ سوشیلا بھی شکر گذاری کے ساتھ اس امداد و اعانت کو قبول کر لیتی تھی۔ جگدیش کو دو ایک مرتبہ سوشیلا کے مکان پر جانے اور اُس کے والد سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔

جگدیش کی دلبستگی کی بظاہر یہی وجہ تھی کہ اُسے سوشیلا کے ادبی مذاق نے متاثر کیا تھا۔ لیکن مذاق کی اس یگانگت کے ساتھ ساتھ جگدیش اپنے جذبات میں ایک ایسا اضطراب محسوس کرنے لگا تھا۔ جس کا اُسے پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں اب اُسے پہلا سا لطف نہیں آتا تھا۔ لائبریری میں نئی نئی کتابیں آرہی تھیں۔ لیکن جس جوشِ مسرت سے جگدیش ہر نئی کتاب کا خیر مقدم کرنے کا عادی تھا۔ اب وہ جوش بہت حد تک سرد پڑ چکا تھا۔ وہ اپنے کام سے غافل تو نہیں ہوا تھا لیکن کام اب اُس کے لئے خوشی اور اطمینان کا ذریعہ نہ رہا تھا اُس کے دل میں ایک ایسا خلا پیدا ہو رہا تھا۔ جسے پُر کرنا اُس کے موجودہ مشاغل کے لئے ممکن نہ تھا۔ سوشیلا سامنے آتی تو اُس کے قلب کی حرکت اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں یہ تڑپتا ہوا دل سینہ چیر کر باہر نہ نکل آئے۔ مکان کی بے کیف تنہائی اب اُس کے لئے ایک بارِ گراں بن رہی تھی۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ شام کو لائبریری سے فارغ ہو کر گھر آنے کی بجائے شہر سے بہت دور کسی اُجاڑ مقام پر

چلا جاتا تھا۔ وہاں کبھی بے تابی سے ٹہلنے لگتا اور کبھی چُپ چاپ آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑا رہتا تھا۔ اُس کی راتوں کی نیند اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ کئی بار اُس نے بستر پر کروٹیں لیتے لیتے صبح کر دی۔ وہ حیران تھا کہ اس پریشانی کو دنیا کی راز جُو نگاہوں سے کیونکر چھپائے رکھے۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں عالم اضطراب میں اُس کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جس سے لوگوں پر اُس کے دل کا کوئی گوشہ بے نقاب ہو جائے۔

ظاہری وضع قطع اور لباس کے متعلق وہ ہمیشہ بے پروا رہا تھا لیکن اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ سر کے بال پریشان ہیں تو کئی کئی روز کنگھی کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ کپڑے میلے ہیں تو مسلسل کئی روز سے وہی میلے کپڑے پہن رہا ہے۔ ڈاڑھی بڑھ گئی ہے تو بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ خط بنانے کا ہوش تک نہیں۔ لائبریری میں کام کے وقت اُس کی پریشانی میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ اُس کے چہرے کی رنگت ہر روز پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ اُس کے دوستوں کا خیال تھا کہ شاید وہ کسی بیماری میں مبتلا ہے لیکن بار بار پوچھنے پر بھی وہ کوئی معقول جواب دینے کے قابل نہ ہوتا تھا۔ اصرار کے ساتھ دریافت کیا جائے تو وہ ہنسی ہنسی میں ٹال دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ ایسا کرتے وقت بے اختیار اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک آ جاتی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ اس رنج و کرب کو کتابوں کے انبار میں دفن کر دینے کی کوشش کی۔

لیکن مطالعہ سے اُس کی طبیعت ہر روز اُچاٹ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ علم و ادب کی دلچسپیاں اور شعر و سخن کی رنگینیاں کم ہو رہی ہیں۔ سوشیلا کی تصویر اُس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکی تھی۔ مصروفیت ہو یا بیکاری، خواب ہو یا بیداری ایک لمحہ کے لئے بھی وہ دل آویز و رُوح پرور تصویر آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی تھی وہ حیران تھا کہ اگر یہ راز افشا ہو گیا تو مصیبت کا کتنا بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ سوشیلا پر کس شدت سے طعن و تشنیع کی بارش شروع ہو جائے گی اور وہ خود ذلت و پستی کی کتنی عمیق گہرائیوں میں غرق ہو جائے گا۔ اُسے اپنی تباہی کی چنداں فکر نہ تھی لیکن سوشیلا کی رسوائی کے تصور ہی سے وہ کانپ کانپ اٹھتا تھا۔ پھر جب وہ نگاہ اُٹھا کر اپنی طرف دیکھتا تو قدرت کی ستم ظریفی اُسے حد درجہ مضحکہ انگیز و دردناک معلوم ہوتی تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے کریہہ المنظر، چالیس سال کی ادھیڑ عمر کا تھکا ماندہ آدمی۔ مال و دولت اور دنیوی وجاہت سے یکسر محروم، تمسخر انگیز لباس میں ملبس۔ اس ہیئت کذائی کے ساتھ سوشیلا کا نام لینا بھی اُس کے نزدیک جرم سے کم نہ تھا۔

لائبریری میں اُس کی بدحواسی اور خود فراموشی کو سوشیلا نے بھی محسوس کیا۔ وہ آتی تو جگدیش کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ آنکھ بھر کر اُس کی طرف نہ دیکھ سکتا تھا۔ اُس سے باتیں کرتا تھا لیکن آنکھیں دائیں بائیں ہر چیز کا جائزہ لینے میں مصروف رہتی تھیں۔ کئی دفعہ تو یہ بھی ہوا کہ سوشیلا نے ایک

کتاب مانگی اور جگدیش نے گھبراہٹ میں دوسری کتاب اُٹھا کر دے دی۔ سوشیلا اس بدحواسی پر جی بھر کے ہنستی تھی لیکن جگدیش پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھ کر دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا کہ کہیں دیپ کن چپکے ہی چپکے سوشیلا کے کان میں اپنا پیغام نہ کہہ دے۔ یہ راز آخر کب تک چھپ سکتا تھا سلگتی ہوئی آگ کا دھواں یوں دبائے سے کب تک دب سکتا تھا۔

سوشیلا کی دو ہم سبق سہیلیاں اشاروں ہی اشاروں میں سب کچھ سمجھ گئیں۔ انہوں نے سوشیلا کو بنانا شروع کیا تو سوشیلا نے جگدیش کی جانب سے بالکل بے اعتنائی برت کر لائبریری میں آنا جانا کم کر دیا۔

جگدیش نے دفعتہً ایک روز تہیہ کر لیا کہ ملازمت چھوڑ کر کہیں چلا جائے یوں دن رات سولی پر لٹکے رہنا اور روح کو ایک مستقل عذاب میں مبتلا کئے رکھنا اُس کے لئے ممکن نہ تھا۔ پھر وہ جانتا تھا کہ اگر وہ چندے وہاں اور ٹھہرا تو بات نکل جائے گی اور اُسے شاید اس سے بدتر حالات کا مقابلہ کرنا پڑے اُس نے چپکے سے استعفےٰ دے دیا اور ایک رات جلد جلد سامان باندھ کر لاہور کو الوداع کہہ دی وہ خود نہیں جانتا تھا کہ منزل کہاں ہے اور اُسے کدھر کا رُخ کرنا چاہیئے۔ ایک دُور دراز مقام کا ٹکٹ اُس کی جیب میں پڑا تھا اور گاڑی سنسان رات کی خاموشی میں چیختی چلاتی اُسے اڑائے لئے جا رہی تھی۔ اُس کا عمر بھر کا سرمایہ اُس کی کتابیں بہت سے بکسوں میں بند اُس کے ہمراہ تھیں۔

اُس کی رفیق تنہائی مینا پنجرے میں آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ گذشتہ چند روز جگدیش مینا کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن یہ ننھا سا پرندہ غم والم کی اس شدت سے قطعاً بے خبر تھا جس نے اُس کے آقا کی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا تھا

گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافر ذکر کر رہے تھے کہ راج نگر میں طاعون اس تیزی سے پھوٹ پڑا ہے کہ دِنوں ہی میں گرد و نواح کی آبادیاں خالی ہو گئی ہیں۔ ایک شخص نے جو حال ہی میں اس علاقے سے ہو کر آیا تھا وبا کی ہلاکت آفرینی کے ایسے ایسے چشم دید واقعات بیان کئے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے بتایا کہ کوئی گھر نہیں رہا جس سے ایک دو لاشیں نہ نکلی ہوں۔ بہت سے خاندان تو بالکل تباہ ہو گئے ہیں۔ دس دس آدمیوں کے کنبے میں ایک متنفس نہیں بچا۔ ڈھور ڈنگر تک مر رہے ہیں۔ حکومت ہر قسم کی طبی امداد پہنچا رہی ہے لیکن وبا کا زور کم ہونے میں نہیں آتا۔

جگدیش کانوں سے سب کچھ سُن رہا تھا۔ لیکن اُس کا خیال طاعون کی تباہ کاریوں اور موت و ہلاکت سے روندی ہوئی بستیوں سے بہت دور کسی نامعلوم سرزمین میں بھٹک رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے عجیب و غریب نقشے بن بن کر بگڑ رہے تھے۔ پھر ایک دم ایسا ہوا کہ اُس نے مسافروں کی گفتگو کو

بہت غور سے سننا شروع کیا۔ اُس کا فطری جذبۂ رحم بیدار ہو گیا۔ طاعون سے مرتے ہوئے لوگوں کی بے بسی، تیمارداروں کی گریہ وزاری اور رونے والوں کی چیخیں گویا اُس کے کانوں تک آرہی تھیں۔ اُس نے سوچا کہ وہ کیوں نہ راج نگر چلا جائے اور اپنی بے مصرف زندگی کو نوعِ انسان کی خدمت میں صرف کرے۔ طاعون سے تڑپتے ہوئے مرد اور مصیبت میں مبتلا عورتیں اور بچے آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحہ میں اُس کی چشمِ تصور نے آفت رسیدہ آبادی کے گوشے گوشے کی سیر کر لی تھی اور اب اس کا مصمم ارادہ ہو گیا تھا۔ کہ وہ راج نگر جائے گا اور آخری دم تک لوگوں کو وبا سے بچانے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے مسافروں سے راج نگر کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ بہرام گڈھ سے گاڑی بدل کر راج نگر جانا پڑتا ہے

رات کے تین بجے بہرام گڈھ کا اسٹیشن آیا تو جگدیش گاڑی سے اُتر آیا صبح پانچ بجے اُسے دوسری گاڑی ملی جس نے اُس کو راج نگر سے دس میل کے فاصلے پر پہنچا دیا۔ یہ جگہ طاعون زدہ علاقے میں شامل تھی۔ اِس لئے خوف وہراس کے مارے لوگ مکان چھوڑ چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ سرکاری ڈاکٹر نے جگدیش سے باصرار کہا کہ واپس چلا جائے۔ لیکن جگدیش نے منتیں کر کر کے اپنی رضاکارانہ خدمات اُس کے سپرد کیں۔ ڈاکٹر ہمدردی کے اس بے لوث جذبے کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا ابھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی جو دوسرں

کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہاں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد ڈاکٹر کی زیر ہدایت جگدیش راج نگر چلا گیا۔ یہاں بھی سرکار کی طرف سے ایک شفاخانہ بنا دیا گیا تھا۔ جگدیش صبح و شام مریضوں کی تیمار داری میں مصروف رہتا تھا غلیظ اور بدبو دار کوٹھڑیوں میں جہاں تعفن سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ جگدیش ایسے سکون اور اطمینان سے گویا کچھ محسوس ہی نہیں کرتا۔ گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے ایسے ایسے بیماروں کی خدمت کرتا تھا جن کے قریب جانے سے ڈاکٹر بھی گھبراتے تھے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ فرشتۂ رحمت کہاں سے آگیا ہے ایک غریب عورت جس کا خاوند چند روز پہلے اجل کا شکار ہوا تھا۔ جگدیش کے ہاتھوں میں مری۔ اس عورت نے مرتے وقت حسرت سے جگدیش کی طرف دیکھا۔ اور اپنی تیرہ چودہ سال کی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ تم خیال رکھنا"

جگدیش کے دل میں مرنے والی کی حسرت و یاس سے لبریز نگاہیں تیر کی طرح پیوست ہو گئیں۔ وہ اُسی روز اس لڑکی کو اپنے مکان پر لے آیا

ایک مہینے تک وبا نے قیامت ڈھائی۔ پھر آہستہ آہستہ حالت سدھرنے لگی۔ ڈاکٹروں نے اپنی رپورٹ میں جگدیش کی خدمات کا بہت شاندار لفظوں میں ذکر کیا اور حکومت نے بھی سرکاری طور پر اُن کا اعتراف کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ جب حالات بہتر ہو گئے تو جگدیش نے

مستقل طور پر راج نگر ہی میں اقامت اختیار کر لی۔ راج نگر کے لوگ اُسے اوتار جان کر اُس کی خدمت کرنے لگے تھے۔ گاؤں کا بچہ بچہ جگدیش کو اپنا محسن سمجھتا تھا۔ کچی پکی اینٹوں کے ایک صاف ستھرے مکان میں، جو آبادی سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ جگدیش کا قیام تھا۔ وہ یتیم لڑکی، شانتی اُس کا نام تھا، جگدیش کے پاس ہی رہتی تھی۔ وہی اُس کا کھانا پکاتی۔ گھر بار کی صفائی کرتی اور اُس کی چیزوں کو قرینے سے رکھتی تھی۔ جگدیش حیران تھا کہ وہ کیوں وبا کا شکار نہیں ہوا۔ اُس کے گردوپیش دھڑا دھڑ لوگ مر رہے تھے۔ بہتوں نے تو اُس کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ وہ کس معجزے سے بچ گیا تھا

وبا کی آگ بجھ گئی تو اُس کے دل کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں روشن ہو گئیں۔ نیو ایرا لائبریری کی روزمرہ زندگی کی چہل پہل کسی وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹتی تھی۔ اِس دور اُفتادہ آبادی کے گوشۂ تنہائی نے جگدیش کے خیالات کو قدرے یکسوئی بخشی تو اُس کے رُکے ہوئے جذبات نے اُس کے قلم کی روانی کے ساتھ بہنا شروع کیا۔ ملک کے تمام اخبارات و رسائل میں اُس کا کلام شائع ہونے لگا۔ لیکن اُس کے مضامین اور اُس کی نظمیں اُس کے نام سے نہیں چھپتی تھیں۔ اُس نے "مسافر" کا فرضی نام اختیار کر لیا تھا۔ کشمیر سے لے کر مدراس تک ہندوستان بھر کی ادبی فضا چند مہینوں

میں "مسافر" کے نام سے گونج اٹھی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ "مسافر" کون ہے خود رسالوں کے ایڈیٹر بھی اِس پُر اسرار شخصیت سے ناواقف تھے۔ دنیا نے یکایک صرف یہی محسوس کیا کہ ہندوستان کے آسمانِ ادب پر "مسافر" کے پسِ پردہ ایک ایسا آفتاب طلوع ہوا ہے جس کی روشنی کے سامنے تمام روشنیاں ماند پڑ گئی ہیں۔ تازہ کلام کے علاوہ جگدیش کے پاس دس پندرہ برس کی نثر و نظم کا ایک ذخیرہ پڑا تھا جسے اب تک اُس نے ہوا نہیں لگائی تھی یہ ذخیرہ بھی اب لٹایا جا رہا تھا۔ نقادوں نے "مسافر" کے کلام پر تنقیدیں لکھنا شروع کر دیں۔ ادبی انجمنوں میں "مسافر" کے کلام پر مقالات پڑھے جانے لگے۔ جدید شاعری کے رجحانات سمجھانے کے لئے اسکولوں اور کالجوں کے پروفیسر طلبہ کے سامنے "مسافر" کا کلام پیش کرنے لگے تھے۔ لوگوں نے شوق و عقیدت سے "مسافر" کا کلام اپنی بیاضوں میں جمع کرنا شروع کیا۔ جگدیش کے اشعار میں یاس و حرماں اور مہجوری و کم نصیبی کی ایسی دلدوز تلخی تھی کہ پڑھنے والے دل تھام کر رہ جاتے تھے۔ پھر جب وہ اپنے والہانہ شوق کو نغموں کا لباس پہناتا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا گوہر بار قلم فردوس کی بہاریں زمین پر کھینچ لایا ہے۔ اُس کے علمی مضامین نے جو اُس کے وسیع مطالعہ اور اس کی عمر بھر کی دماغی کاوش کا نتیجہ تھے، تحقیق و تفتیش کی نئی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ اِس تمام انقلاب انگیز تحریک کے باوجود جگدیش کی شخصیت لوگوں کے لئے ایک معمہ بنی

بنی ہوئی تھی۔ اُس کے متعلق ہر قسم کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں بعض سمجھتے تھے کہ "مسافر" کوئی ایک شخص نہیں بلکہ چند افراد نے مل کر یہ نام اختیار کر لیا ہے اور اس ضمن میں عجیب عجیب مضحکہ انگیز خیالات کا اظہار کیا جا رہا تھا

ایک دن جگدیش نے اخبار میں ایک نئے ادبی رسالے کے اجرا کا اعلان دیکھا اور پھر اُس پر ایک ایسی بے خودی سی طاری ہو گئی کہ وہ شام تک کھویا کھویا پھرتا رہا۔ اعلان تھا کہ دہلی سے عنقریب ایک ماہنامہ "بہار" شائع ہو رہا ہے جس کی ایڈیٹر مس سوشیلا دیوی ہوں گی۔ جگدیش کو علم تھا کہ سوشیلا بی اے کر چکی ہے اور اپنے والد کے ساتھ جنہوں نے ملازمت سے پنشن حاصل کر لی تھی۔ دہلی میں مقیم ہے۔ جگدیش کو اس خیال سے کہ سوشیلا نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے مستقل طور پر ایک ماہوار رسالے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس قدر مسرت ہوئی کہ اس دور دراز مقام پر بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنے آپ کو بالکل سوشیلا کے قریب محسوس کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سوشیلا "مسافر" کے نام سے ضرور آشنا ہو گی اور اُس کے کلام کو اپنے رسالے میں یقیناً جگہ دے گی۔ اس خیال سے تقویت حاصل کر کے اُس نے ایک نظم اور ایک نثر کا ٹکڑا "بہار" کی اولیں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ سوشیلا نے "مسافر" کے عطیئے کو بڑے فخر و انبساط کے ساتھ اپنے رسالے میں سب سے نمایاں جگہ دی اور اُمید ظاہر کی کہ "مسافر" آئندہ بھی نظرِ توجہ سے سرفراز کرتے رہیں گے

اب یہ حالت تھی کہ بہار کا ہر پرچہ "مسافر" کے بہترین افکار سے مزین ہو کر نکلتا تھا۔ اس خصوصیت نے اس کی مقبولیت اور اشاعت میں بہت جلد اضافہ کر دیا تھا۔ سوشیلا نے "مسافر" کے ہر مضمون کے لئے تعریف و توصیف کا ایک صفحہ وقف کر رکھا تھا جس میں بالالتزام وہ اس کے ادبی محاسن کھول کھول کر بیان کرتی تھی۔ ایک روز جگدیش کو دفعتہً سوشیلا کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا کہ دہلی کی ادبی مجالس اس کی شرکت کی خواہاں ہیں۔ خط میں "مسافر" کی شاعری اور ادبی قابلیت کی مدح و ستائش کے لئے لغت کا ہر اچھا لفظ استعمال کرنے کے بعد بڑے عجز و انکسار سے التجا کی گئی تھی کہ وہ دہلی کو اپنی تشریف آوری کی عزت بخشیں۔ لکھا تھا کہ "مسافر" کے استقبال کے لئے شہر کے تمام علم دوست حضرات کی ایک مجلس مرتب کی جا چکی ہے اور اگر جواب اثبات میں آیا تو یہ مجلس ابھی سے مناسب انتظام و اہتمام شروع کر دے گی۔

جگدیش ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ وہ حیران تھا کہ اس دعوت کا کیا جواب دے۔ کیا اسے قبول کر لے؟ اس خیال کے ساتھ ہی ماضی کی تمام تلخیاں تمام ناکامیاں اور تمام پریشانیاں اس کے دماغ پر یورش کر آئیں۔ کیا وہ دہلی جا کر ان سوئے ہوئے فتنوں کو دوبارہ جگا دے۔ کیا اپنے دل و دماغ کو پھر ان تیروں کے لئے کھلا چھوڑ دے جن کی زد سے بچنے کے لئے اس نے بصد مصیبت یہ بیابان منتخب کیا تھا۔ کیا وہ طوفان پھر بپا ہو جائے جس نے اس کی

زندگی کی ناؤ کو ڈانواں ڈول کر دیا تھا، یہ سب کچھ درست تھا لیکن جگدیش کے دل کے کسی چھپے ہوئے گوشے سے رہ رہ کر آواز آ رہی تھی کہ دہلی ضرور جانا چاہیئے شاید اِس لیئے کہ برق وخس کا افسانہ پھر تازہ ہو اور جگدیش کے قلب کی سطح پر جو سکون سا طاری ہو گیا تھا اُس میں نئے سرے سے تلاطم آ جائے اور "مسافر" کی شاعری طُور کی ایک جھلک سے پھر نور پاش و صبر آزما ہو جائے

جگدیش نے جواب میں لکھ دیا کہ "مسافر" دہلی آ رہا ہے سوشیلا خیال ہی خیال میں "مسافر" کی تصویر بنا رہی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جس شخص کی شاعری اِتنی جذبات پرور، اتنی شرر فشاں، اتنی شعلہ طراز ہے، وہ خود کس قدر حسین وجمیل اور جذبات انگیز ہو گا۔ اُس کے خیالات کے اُفق پر ایک جوانِ رعنا کی دلفریب صورت چمک رہی تھی جس کے سیاہ گھنگریالے بال شاعرانہ انداز میں پیشانی پر بکھرے ہوئے ہیں جس کی دو خوبصورت غزالیں آنکھیں دیکھنے والے کے دل میں تیر کی طرح اُتری جاتی ہیں اور جس کے نازک سے ہونٹوں پر ملکوتی نغمے رقص کر رہے ہیں وہ بولتا ہے تو اُس کی آواز پر موسیقی کا دھوکا ہوتا ہے، وہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے تو ہر چیز کیفِ بے خودی سے سرشار ہو جاتی ہے اور جب وہ کسی محفل میں بیٹھتا ہے تو تنہا اُس کی موجودگی بزم کو شگفتہ بنا دیتی ہے، یہ تھا سوشیلا کا "مسافر"

وقتِ مقررہ پر جگدیش ریل گاڑی سے دہلی کے اسٹیشن پر پہنچا وہ ایک

تیسرے درجے میں سوار تھا۔ جوں جوں دہلی کا اسٹیشن قریب آرہا تھا، اس کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ اسٹیشن پر سوشیلا، اُس کے والد اور شہر کے بہت سے معزز مرد عورتیں پھولوں کے ہار لئے موجود تھے۔ گاڑی آئی تو لوگ بے اختیار فرسٹ سیکنڈ کلاس کے ڈبوں کی طرف بھاگے۔ فرسٹ کلاس میں سے ایک حد درجہ خوبصورت، جامہ زیب نوجوان نکلا تو سوشیلا نے بڑھ کر پوچھا "آپ مسافر ہیں؟"

نوجوان نے کسی قدر حیران ہو کر جواب دیا۔ "جی ہاں"

سوشیلا نے لپک کر اُس کے گلے میں ہار ڈال دیئے۔ اتنے میں سوشیلا کے والد اور بیس پچیس آدمی اُس طرف آ گئے اور نووارد کو سب نے اِتنے ہار پہنائے کہ اُس کی آنکھیں تک چھپ گئیں۔ ہر طرف شور تھا کہ "مسافر آگیا، مسافر آگیا"

نوجوان بولنا چاہتا تھا لیکن بھیڑ اس قدر تھی اور لوگ اُس پر یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے کہ کوشش کے باوجود اُس کے حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اتنے میں جگدیش گاڑی سے اُتر کر آہستہ آہستہ اس طرف آیا تو اُس نے دیکھا کہ لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے ہیں اور پھولوں سے لدے ہوئے نوجوان کی طرف اشارے کر کر کے کہہ رہے ہیں کہ "یہی مسافر ہے"

جگدیش ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُس نے حیرت و استعجاب سے پھٹی ہوئی

آنکھوں کے ساتھ سوشیلا کو دیکھا جو اُس نوجوان کے پاس کھڑی پھولوں میں تپتے ہوئے چہرے کو انتہائی محبت و اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور آنکھوں سے ایسی بے پایاں مسرت کا اظہار ہو رہا تھا جو عورت صرف اپنے محبوب کو دیکھنے کے بعد ہی محسوس کرتی ہے۔

جگدیش ایک لمحہ میں صورتِ حال سے آگاہ ہو گیا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا اُس کے پاؤں جمے کے جمے رہ گئے۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ جا کر کہہ دے کہ "اصلی مسافر میں ہوں" تو کیا لوگ اُس کی بات کا یقین کر لیں گے۔ کیا اُس کی کریہہ صورت، اُس کے پھٹے ہوئے کپڑے جو پکار پکار کر اس کی مفلسی کا اعلان کر رہے تھے اور اُس کا نحیف و زار سال خوردہ جسم اُس کے بیان کی تصدیق کر سکیں گے؟ پھر اُس نے سوچا کہ ممکن ہے کہ لوگ اُس کے الفاظ پر اعتبار کر لیں لیکن سوشیلا کی مسرت فنا ہو جائے گی۔ اُس کے خیالات کا حسین و جمیل محل پاش پاش ہو جائے گا۔ اُس نے پھر آنکھ اٹھا کر سوشیلا کو دیکھا جو نوجوان کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم سے باہر جا رہی تھی۔ مسرت کی وہی سرخی گلگونۂ عارض بن کر اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ برسوں سے وہ ایک دلآویز خواب دیکھ رہی تھی اور آج اپنے خواب کی تعبیر اُس نے پالی تھی۔ جگدیش نے ارادہ کر لیا کہ سوشیلا کے اِس فریبِ مسرت کو قائم رہنا چاہیئے۔ قدرت نے خود اُسے ایک نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا رفیق عطا کیا تھا۔ یہ خودغرضی

اور ظلم ہے کہ وہ اپنی خاطر اُس کی خوشی میں خلل انداز ہو

جگدیش چپکے سے بھیڑ میں گھُس گیا اور لوگوں کی نظروں سے بچ کر اُس نے کاغذ کا ایک پرزہ اُس نوجوان کے ہاتھ میں دے دیا۔ پرزے پر لکھا تھا کہ مُسافر ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کا نام ہے۔ تم اگرچہ وہ مسافر نہیں ہو لیکن کسی غلط فہمی سے لوگ تمہیں وہی مسافر سمجھ رہے ہیں۔ خدارا اس مغالطے کو برقرار رہنے دو۔ تمہاری اور سب کی بہتری اسی میں ہے!!

نوجوان نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی اور فوراً جیب میں رکھ لیا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ قدرت نے اُسے کس ڈرامے کا ہیرو بنا دیا ہے۔

نسو شیلا کے والد مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہی کے مکان پر فرضی "مسافر" کو ٹھہرایا گیا۔ نوجوان نے تکان کا عذر پیش کر کے کچھ دیر آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ تنہائی میں اس معاملے پر اچھی طرح غور کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ علیحدہ کمرے میں چلا گیا تو جگدیش جو شروع سے اب تک مکان کے گرد چکّر کاٹ رہا تھا۔ کسی طرح اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اب اصلی اور نقلی "مسافر" آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جگدیش نے جب واقعات سے پردہ اٹھایا تو نوجوان نے بے تابی سے جگدیش کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ آپ کیوں ابھی اس بات کا اعلان نہیں کر دیتے کہ اصلی مسافر آپ ہیں!!

جگدیش نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے حسرتناک لہجے

میں کہتا آپ سوشیلا کو نہیں دیکھتے! اُس کی ہر نگاہ جو آپ پر پڑتی ہے اپنے اندر جذبات کی ایک دنیا رکھتی ہے وہ ایک مقناطیسی کشش سے آپ کی طرف کھنچی آ رہی ہے۔ میں کون ہوں کہ آپ کے اور اُس کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کروں۔ اگر میں حقیقت کا افشا کر دوں تو سوشیلا کو کس قدر صدمہ ہو گا۔ اُس کے آبگینۂ دل کو کیسی سخت ٹھیس پہنچے گی۔ دو دلوں کو جو آپس میں ملنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں ایک دوسرے سے جدا کر دینا ظلم ہے۔ اب مصلحت یہی ہے کہ آپ مسافر بنے رہیئے"

نوجوان نے شعر و ادب سے اپنی بے خبری کا اظہار کیا تو جگدیش نے کہا کہ "اس مشکل کا حل بہت آسان ہے۔ میں آپ کا سیکرٹری بن جاتا ہوں اور ہر وقت آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گا۔ آپ کے اعزاز میں یہاں چند جلسے ہوں گے۔ میں ہر موقع پر آپ کو موزوں تقریر لکھ دیا کروں گا اور آپ بہت آسانی سے اپنا فرض ادا کر سکیں گے۔ میرے کلام کا مجموعہ آپ رکھ لیجئے۔ ہر جلسے میں جتنی چاہیں آپ نظمیں سنا سکتے ہیں"

"مسافر" کے اعزاز میں دہلی میں متعدد جلسے منعقد کئے گئے۔ ادبی مجالس کی طرف سے سپاسنامے پیش ہوئے۔ طلبہ نے اپنے اپنے کالج میں "مسافر" کو دعوت دی کہ اُس کی زبان سے اس کا کلام سننے کا فخر حاصل کریں مشاعرے ہوئے جہاں "مسافر" کو دیکھنے اور اُس کا کلام سننے کے لئے ہجوم اکٹھے ہوتے

رہے۔ نوجوان نے بہت جلد اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا تھا۔ ہر موقع پر اُس نے بہت متانت سے اپنا کام سر انجام دیا۔ جگدیش ایک لمحہ کے لئے بھی اُس سے جدا نہ ہوتا تھا۔ سوشیلا نے جب جگدیش کو دیکھا تو کسی قدر بے اعتنائی اور استہزا کے ساتھ پوچھا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں غائب رہا۔ اُس نے بھی بہت روکھے پن سے جواب دیا کہ وہ دو سال سے "مسافر" کے سکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔

صرف ایک موقع پر ایسا ہوا کہ ایک جلسے میں "مسافر" ادب اور زندگی کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا کہ بھول گیا۔ چنانچہ بہت مضطرب اور پریشان ہو کر وہ جلدی سے بیٹھ گیا۔ جگدیش نے فوراً کھڑے ہو کر کہا کہ "مسافر کچھ بیمار ہیں۔ اس لئے تقریر میں مکمل کئے دیتا ہوں"۔

جگدیش نے بولنا شروع کیا تو اُسے روانی میں اس بات کا خیال نہ رہا کہ وہ "مسافر" کا سکرٹری ہے۔ اُس نے بے اختیاری میں اس قدر فصیح و بلیغ تقریر کر دی کہ لوگ اس کی قابلیت پر حیران رہ گئے۔ سوشیلا بھی تعجب سے اُس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ پھر یکایک جگدیش کو خیال آیا کہ وہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ اپنی تقریر کو توڑ مروڑ کر ایک دم بیٹھ گیا۔

پندرہ روز وہ نوجوان "مسافر" کے بھیس میں سوشیلا کے مکان میں ٹھہرا رہا۔ سوشیلا کے ساتھ اُسے بھی بہت اُنس ہو گیا تھا۔ سوشیلا کا حُسن و جمال،

اُس کے اخلاق و عادات کی پاکیزگی، اُس کی علمی و ادبی قابلیت۔ یہ چیزیں ایسی نہ تھیں کہ نوجوان کو مسحور کئے بغیر رہتیں۔ سوشیلا کے والد اپنی بیٹی کے دل کی کیفیت سے بے خبر نہ تھے۔ انہیں اس تجویز پر کہ سوشیلا "مسافر" سے شادی کر لے قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ آہستہ آہستہ یہ تجویز پختہ ہوتی گئی۔ جگدیش نے محسوس کیا کہ اب دہلی میں مزید قیام مصلحت کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس نے ارادہ کر لیا کہ خاموشی سے واپس راج نگر چلا جائے۔ نوجوان کو اُس نے اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ سخت غمگین ہو گیا۔ وہ جگدیش کی جدائی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ جگدیش ہمیشہ اُس کے ساتھ رہے۔ جگدیش نے اپنی غیر فانی شہرت کا جگمگاتا ہوا تاج اُس کے سر پر رکھ کر جس قربانی کا ثبوت دیا تھا اُس نے اُس کو شہید کا مرتبہ دے دیا تھا

جگدیش راج نگر چلا گیا تو نوجوان سخت دل گرفتہ اور اداس نظر آنے لگا یہ بات کہ سوشیلا "مسافر" سے شادی کرنے والی ہے عام مشہور ہو گئی تھی۔ نوجوان اب شادی سے گریز کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک مجرم سمجھنے لگا تھا۔ اُس نے دنیا بھر کو ایک خطرناک فریب میں مبتلا کئے رکھا تھا۔ اب ایک خوبصورت مہذب متمول لڑکی کو وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک فریب کا شکار کرنے والا تھا۔ اس چیز کا تصور ہی اُس پر رعشہ طاری کر رہا تھا۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ راز کھول دے گا۔ جھوٹ کا یہ قلعہ جسے قدرت کے پُر اسرار ہاتھوں نے تعمیر

کیا تھا اب وہ خود اپنے ہاتھ سے گرا کر ریزہ ریزہ کر دے گا۔ سوشیلا کے والد اپنی بیٹی کی شادی کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ رخصتانہ سے پہلے منگنی کی رسم ادا ہو جائے۔ اِدھر نوجوان جب ذہنی کشمکش سے بالکل مغلوب ہو گیا تو منگنی سے ایک روز پہلے اُس نے سوشیلا کو بتا دیا کہ وہ "مسافر" نہیں ہے

دفورِ حیرت سے سوشیلا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ جہاں کھڑی تھی گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُسے یوں معلوم ہوا کہ کسی نے اُس کے سینے میں گولی مار دی ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نوجوان کو دیکھ رہی تھی جو مٹی کے بُت کی طرح گم سُم سامنے کھڑا تھا شرم سے اُس کی نگاہیں زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ سوشیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں گویا وہ ابھی چیخ مار کر رو دے گی، پوچھا کہ "پھر یہ فریب کیوں جاری رکھا گیا؟"

تو نوجوان نے بتایا کہ "اصلی مسافر جگدیش ہے"

سوشیلا کے دل و دماغ پر یہ پہلے سے بھی تُلا ہوا وار پڑا اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ضبط کے باوجود دو بڑے بڑے، موتی کی طرح آبدار۔ لرزتے ہوئے آنسو زمین پر گر پڑے۔ اُس نے نوجوان سے کہا کہ وہ اس بات کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کرے گی۔ جب تک جگدیش اُس کے سامنے اِس کا اعتراف نہ کر لے

اُسی رات وہ دونوں، نوجوان اور سوشیلا، موٹر میں بیٹھے راج نگر کو اڑے چلے جا رہے تھے۔ موٹر اپنی پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ تیسرے پہر وہ راج نگر پہنچے۔ اور پتہ معلوم کر کے سیدھے جگدیش کے مکان میں داخل ہو گئے۔ جگدیش آنکھیں بند

کئے چارپائی پر پڑا تھا۔ وہ جب سے واپس آیا تھا اختلاجِ قلب کے ایک ایسے شدید دورے میں مبتلا تھا کہ اب اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ کمرے میں ایک بوسیدہ سا لمپ ٹمٹما رہا تھا۔ یتیم لڑکی شانتی چپ چاپ گردن جھکائے چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلنے سے شور ہوا تو جگدیش نے آنکھیں کھول دیں ضعف سے اُس کے پپوٹے بند ہوئے جا رہے تھے۔ سوشیلا کا دل دھک دھک کرنے لگا سہم کر اُس نے دہنے ہاتھ کی انگلی دانتوں میں دبا لی اور خاموشی سے اُس کی چارپائی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ جگدیش نے سوشیلا کو پہچان لیا۔ اُس کے زرد، بے جان چہرے پر مسرت کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ اُس کی بے نور آنکھوں میں ایک ثانیہ کے لئے روشنی کی خفیف سی جھلک آئی اور پھر غائب ہو گئی

سوشیلا نے جھک کر بہت نرمی سے پوچھا۔ "کیا تم ہی مسافر ہو؟"

جگدیش کی آنکھیں سوشیلا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے آہستہ سے سر کو جنبش دی اور اس سے بھی زیادہ آہستہ آواز میں کہا "ہاں"

اُس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں

باہر رات کی سیاہی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔ مشرق سے سپیدۂ سحر کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ یک لخت کہیں سے آواز آئی۔ "صبح ہو گئی!" سوشیلا نے گردن پھرا کر دیکھا۔ مینا پنجرے میں بیٹھی چہچہا رہی تھی ◆
